بانی : حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

مدیر : خالد سیف اللہ رحمانی

سہ ماہی مجلہ بحث ونظر حیدرآباد

شمارہ نمبر : ۱۱۹-۱۲۰ / ۱۷-۱۸	جنوری — جون ۲۰۲۰ء	جمادی الاول ۱۴۴۱ھ — شوال ۱۴۴۱ھ

زرِتعاون

اندرون ملک

ایک شمارہ:40روپے

سالانہ:150، بذریعہ رجسٹری:200

سہ سالہ:450، بذریعہ رجسٹری:550

بیرونِ ملک

ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ:20امریکی ڈالر

یورپ، امریکہ، افریقہ کے لئے :

سالانہ:30امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony, Po:Pahadi Shareef, Hyd. A.P 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک/ڈرافٹ پر صرف:"Khalid Saifullah" لکھیں

کمپیوٹر کتابت: محمد نصیر عالم سبیلی ''العالم'' اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد، فون نمبر:9959897621 91+

فہرست مضامین

● ● ●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

کورونا کی وبا پوری دنیا میں پھیلی اور ہر ملک نے اس کے تدارک کے لئے اپنے طور پر کوششیں کیں، بہت سارے ملکوں نے سائنسی اندازِ فکر کو اپنا کر جلد ہی اس سے چھٹکارا حاصل کرلیا، دنیا بھر میں ہندوستان ہی واحد ملک تھا، جس نے اس وقت توسخت ترین لاک ڈاؤن نافذ کیا جب کورونا کیس چندسو کے دائرہ میں تھے؛ لیکن جب کورونا کیس لاکھوں تک پہنچ گیا تو مرحلہ وار ملک کوان لاک ڈاؤن کیا جانے لگا، جہاں الیکشن کی تیاری کرنی ہوتی ہے وہاں اچانک سے کورونا کیس کم ہونے لگتے ہیں اور ریلیوں اور بھیڑ بھاڑ کی چھوٹ مل جاتی ہے؛ لیکن جہاں الیکشن کی بات نہ ہو اور حکومت مخالف احتجاج ہو رہا ہو، وہاں کورونا کے پھیلنے کا خطرہ ستانے لگتا ہے۔

پوری دنیا جب کورونا کی وبا سے سائنسی انداز میں نمٹنے کی تیاری کر رہی تھی اور اس کے پھیلنے کے طریقے اور رفتار پر سائنسی تجزیہ کیا جا رہا تھا، اپنے وطن میں برسرِ اقتدار جماعت کا سوشل میڈیا ونگ ملک میں کورونا پھیلنے کی ذمہ داری تبلیغی جماعت پر عائد کر رہا تھا، برسرِ اقتدار جماعت کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ موجودہ مسائل سے نمٹنے کے بجائے کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ کھڑا کر کے لوگوں کی نگاہ میں دھول جھونکتی ہے، کورونا کے مسئلہ میں بھی یہی طریقہ قائم رہا، برسرِ اقتدار پارٹی کی شہ پر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے بھی تبلیغی جماعت کو قصوروار ٹھہرانے میں کوئی کمی نہیں کی؛ لیکن جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، بالآخر الٰہ آباد، ممبئی اور دہلی کی عدالت عالیہ نے کھلے عام میڈیا کی اس روش پر سرزنش کی اور تبلیغی جماعت کو اس معاملے میں بے قصور تسلیم کیا۔

کورونا کی وجہ سے جہاں پوری دنیا معاشی طور پر متاثر ہوئی ہے، وہیں مدارس بھی کورونا سے متاثر ہوئے ہیں، اہل خیر حضرات کی ذمہ داری ہے کہ اگر مدارس کے سفرا اور عاملین ان تک نہیں پہنچتے تو وہ ازخود متعلقہ مدارس میں رقم پہنچانے کی کوشش کریں، یہ مدارس کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ گھر گھر جائیں، وہ اپنے سفیروں کو بھیجتے ہیں، یہ مدارس کا احسان سمجھنا چاہئے، ورنہ زکوٰۃ کی رقم نکالنا اور مستحقین تک پہنچانا فرض ہے، مدارس چوں کہ مستحق طلبہ کی اعانت کے ساتھ علم دین کے نشر واشاعت اور فروغ وبقا کی بھی ذمہ داری انجام دے رہے ہیں؛ لہٰذا مدارس کی

اعانت دوہرے اجر کی ضامن ہے اور مدارس تک زکوٰۃ کی رقم پہنچانا صاحب نصاب حضرات کی ذمہ داری ہے، ضرورت ہے کہ ان حالات میں وہ اس ذمہ داری کو محسوس کریں اور اسے انجام دینے کی فکر کریں۔

بحث ونظر کا جنوری تا جون ۲۰۲۰ء کا یہ شمارہ بھی اہم عصری اور فکری مضامین پر مشتمل ہے، اس حقیر کے بھی کئی مضامین شامل ہیں، پہلا مضمون صحابہ کرامؓ کے اقوال وافعال کی شرعی حیثیت پر ہے، یہ اُصولِ فقہ کا اہم مسئلہ ہے اور اس میں اسی موضوع پر اُصولی اعتبار سے گفتگو کی گئی ہے، دوسرا مضمون مسافتِ سفر پر ہے، دورِ حاضر میں جس طرح سے وسائل نقل وحمل میں انقلاب آیا ہے، جس سے مسافتِ شرعی کے تعلق سے کئی سوال سامنے آتے ہیں، اس مضمون میں ان ہی جدید سوالات کو حل کیا گیا ہے، تیسرا مضمون جینیٹک سائنس سے پیدا ہونے والے مسائل پر ہے، واضح رہے کہ جینیٹیک سائنس کے شعبہ میں تیز رفتار ترقی ہو رہی ہے اور اسی اعتبار سے نئے نئے شرعی مسائل پیدا ہو رہے ہیں، اس مضمون میں ان ہی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، چوتھا مضمون گزشتہ سال ۸ر دسمبر کو مونگیر میں حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری کی شخصیت پر ایک روزہ سیمینار کے لئے لکھا گیا مقالہ ہے، جس میں حضرت مولانا مونگیریؒ کی بنیادی فکر کی دور حاضر میں معنویت پر ایک تحریر ہے، ازبکستان کا سفر نامہ بھی اس شمارہ کی زینت ہے، ازبکستان بھی ان ممالک میں سے ہیں، جہاں کی خاک سے بے شمار محدثین اور فقہاء اُٹھے اور جن کے کارنامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے، یہ سفر نامہ وہاں کی علمی وفکری شخصیات کے تذکروں اور مشاہدات سے متعلق ہے، پانچواں مضمون میرے مطالعہ کی روداد پر ہے، جس میں چند سوالوں کے جواب میں شاید نئے فارغین کے لئے کچھ کارآمد نصائح مل جائیں، ایک مضمون دماغی موت اور قتل بہ جذبۂ رحم، شرعی حیثیت اور اس سے متعلق مسائل پر ہے، یہ مضمون معہد کے استاذ فقہ مولانا محمد شاہد علی قاسمی صاحب کا ہے، ایک مضمون آنسو کے مسائل اور فوائد پر ہے جس میں آنسو پر طبی اور شرعی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے، یہ مضمون مولانا جمیل اختر جلیلی ندوی کا ہے، ایک مضمون افتاء اور قضاء کے درمیان فرق اور اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے ہونے والی بے اعتدالیوں کے موضوع پر ہے، یہ مولانا عبداللہ ممتاز قاسمی کا ہے، آپ فی الوقت مالدیپ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، ایک مضمون آٹھویں صدی ہجری کی زندۂ جاوید شخصیت علامہ سعدالدین تفتازانی کی حیات وخدمات پر ہے، اس کے علاوہ اس لاک ڈاؤن میں جوار رحمت منتقل ہونے والی بعض شخصیات پر بھی میری مختصر تحریریں جو تعزیتاً لکھی گئی ہیں، اس شمارے میں شامل ہیں۔

خالد سیف اللہ رحمانی
(بیت الحمد، شاہین نگر، حیدرآباد)

۳۰ر ربیع الثانی ۱۴۴۲ھ
۱۶ر دسمبر ۲۰۲۰ء

• • •

صحابہ کرامؓ کے اقوال وافعال کی شرعی حیثیت

خالد سیف اللہ رحمانی

''صحابی'' کے اصل معنی ''ساتھی'' اور ''رفیق'' کے ہیں؛ لیکن یہ اسلام کی ایک مستقل اور اہم اصطلاح ہے، اصطلاحی طور پر صحابی کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جنھوں نے بحالت ایمان حضور ﷺ سے ملاقات کی ہو اور ایمان ہی کی حالت میں دنیا سے رُخصت ہوئے ہوں، حدیث نبوی ﷺ :

طوبی لمن رآنی ولمن رآی من رآنی ۔ (۱)

خوشخبری ہو اس شخص کے لئے جس نے مجھ کو دیکھا اور اس کے لئے جس نے مجھے دیکھنے والوں کو دیکھا۔

سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ صحابیت کے لئے ملاقات کافی ہے، یہ ضروری نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی طویل صحبت حاصل ہو یا اس نے حضور ﷺ سے کوئی روایت بھی نقل کی ہو، جیسا کہ بعض اہل علم کی رائے ہے؛ بلکہ سعید بن مسیبؒ کے نزدیک تو صحابی ہونے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سال دو سال رہنا اور ایک دو غزوات میں شرکت کرنا بھی ضروری ہے۔(۲)

اسی لئے اصحمہ نجاشی کا شمار صحابہ میں نہیں ہوگا، کہ آپ ﷺ سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوسکا اور جو لوگ ملاقات سے مشرف ہوئے، گو کم عمر رہے ہوں، صحابہ کہلائیں گے، جیسے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور حضرت محمود بن ربیعؓ وغیرہ، سعید بن مسیبؒ کی طرف مذکورہ قول کی نسبت ابن صلاحؒ نے کی ہے؛ لیکن علامہ زین الدین عراقیؒ نے اس پر نقد کیا ہے اور اس نسبت کو غلط قرار دیا ہے؛ کیوں کہ سعید بن مسیبؒ کا یہ قول محمد بن عمر واقدی سے منقول ہے اور واقدیؒ کا حدیث میں ضعیف و نامعتبر ہونا محتاج بیان نہیں۔(۳)

(۱) مجمع الزوائد: ۲۰/۱۰۔

(۲) مقدمہ ابن صلاح: ۱۲۵، النوع التاسع والثلاثون، الفیۃ مصطلح الحدیث للعراقی: ۱۷۴، ''معرفۃ الصحابۃ''۔

(۳) التقیید والایضاح: ۲۸۳۔

صحابیت کا ثبوت

صحابیت کا ثبوت چار طریقوں سے ہوسکتا ہے :

(۱) تواتر کے ذریعہ، جیسے: حضرات خلفاء راشدین اور عشرۂ مبشرہ وغیرہ۔

(۲) تواتر سے کم تر درجہ شہرت کے ذریعہ، جیسے حضرت ضمام بن ثعلبہؓ اور عکاشہ بن محصنؓ وغیرہ۔

(۳) کوئی معروف صحابی کسی شخص کے بارے میں صحابی ہونے کی اطلاع دے، جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حممۃ بن ابوحممہ الدوسیؓ کی بابت صحابی ہونے کی خبردی۔

(۴) کوئی ایسا شخص جس کا عادل ومعتبر ہونا معلوم ہو، اور زمانی اعتبار سے اس کا صحابی ہونا ممکن بھی ہو، اگر اپنے صحابی ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کو قبول کرلیا جائے گا، اس سلسلہ میں علماء کا خیال ہے کہ ۱۱۰ھ کے بعد اگر کوئی شخص صحابیت کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ غیر معتبر ہے، اسی بنا پر جعفر بن نسطور رومی اور رتن ہندی وغیرہ کے دعویٔ صحابیت کو غیر معتبر مانا گیا ہے؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے ۱۰ھ میں ارشاد فرمایا تھا :

ما من نفس منفوسة اليوم يأتي عليها مائة سنة وهي حية يومئذ ۔ (۱)

آج کوئی متنفس نہیں کہ سوسال گذرنے کے بعد بھی وہ زندہ رہے۔

پس ان چار طریقوں سے کسی کا صحابی ہونا تسلیم کیا جاتا ہے۔(۲)

تمام صحابہ عادل ہیں!

اہل سنت والجماعت کے نزدیک تمام ہی صحابہ عادل ومعتبر ہیں؛ خواہ وہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اور اس کے بعد وقوع پذیر ہونے والے فتنہ میں شریک رہے ہوں یا نہیں۔(۳)

صحابہ میں فرق مراتب

اہل سنت والجماعت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے بعد حضرت عمرؓ تمام اُمت میں افضل ہیں، حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ وعلیؓ کا درجہ ہے، جمہور نے حضرت عثمانؓ کو افضل قرار دیا ہے اور علماء

(۱) مسلم کتاب فضائل الصحابة، حدیث نمبر: ۲۵۳۸۔

(۲) مقدمہ ابن الصلاح: ۱۲۵، علوم الحديث ومصطلحه للدكتور صجی المحمصانی: ۳۵۳-۳۵۲۔

(۳) الفیۃ العراقی: ۱۷۴۔

کوفہ نے حضرت علیؓ کو، (۱) امام ابو حنیفہؒ کا رجحان بھی اسی طرف بتایا جاتا ہے ؛ اسی لئے آپ نے اہل سنت والجماعت کی علامات میں حضرات شیخین کی فضیلت اور حضرت عثمانؓ وعلیؓ کی محبت کو شمار کیا ہے، (۲) امام مالکؒ سے اس سلسلہ میں توقف منقول ہے، نیز مشہور محدث محمد بن اسحاق بن خزیمہؒ اور خطابیؒ نے بھی حضرت علیؓ کو افضل مانا ہے۔

خلفاء اربعہ کے بعد پھر ان چھ صحابہ کا درجہ ہے، جو عشرۂ مبشرہ میں ہیں، ان کے بعد اصحابِ بدر، ان کے بعد اصحاب اُحد اور ان کے بعد حدیبیہ میں بیعت رضوان کے شرکاء کا شمار ہے، آخری درجہ فتح مکہ اور اس کے بعد ہونے والے مسلمانوں کا ہے، جن میں حضرت ابوسفیانؓ اور حضرت معاویہؓ وغیرہ ہیں۔

امام ابوحاکم نیشاپوریؒ نے صحابہ کے بارہ طبقات بیان کئے ہیں :

(۱) مکہ میں ابتداءً اسلام قبول کرنے والے جن میں خلفاء اربعہ بھی داخل ہیں۔

(۲) دارالندوہ کے اصحاب، یعنی جب حضرت عمرؓ اسلام لائے اور اپنے اسلام کا عام اعلان واظہار کیا تو وہ آپ ﷺ کو دارالندوہ لے گئے، جہاں اہل مکہ کی ایک جماعت نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، ان حضرات کو 'اصحاب دارالندوہ' کہتے ہیں۔

(۳) حبش ہجرت کرنے والے صحابہ۔

(۴) بیعت عقبہ اول میں شریک رہنے والے صحابہ۔

(۵) بیعت عقبہ ثانی میں شریک رہنے والے صحابہ۔

(۶) وہ مہاجرین جو آپ کے قباء میں رہتے ہوئے پہنچ چکے تھے۔

(۷) غزوۂ بدر میں شریک ہونے والے صحابہ۔

(۸) غزوۂ بدر، صلح حدیبیہ کے درمیان ہجرت کرنے والے صحابہ۔

(۹) وہ صحابہ جو بیعت رضوان میں شریک رہے، جن کے بارے میں قرآن مجید میں آیت نازل ہوئی :

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا۔ (۳)

مسلمان جب درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوئے اور ان کے دلوں میں جو (جذبات) ہیں، اللہ نے انھیں جان لیا، پھر ان کو اطمینانِ قلب عطا فرمایا اور ان کو ایک قریبی فتح کے انعام سے نوازا۔

---

(۱) مقدمہ ابن الصلاح: ۱۲۸۔ (۲) خلاصۃ الفتاویٰ: ۳۸۱/۴۔ (۳) الفتح: ۱۸۔

(۱۰) صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان ہجرت کرنے والے صحابہ، ان ہی میں حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ ہیں۔

(۱۱) جو لوگ فتح مکہ کے دن ایمان لائے۔

(۱۲) وہ کم سن صحابہ جنھوں نے فتح مکہ اور حجۃ الوداع وغیرہ کے موقع سے آپ کی زیارت کی ہے، حضرت سائب بن یزیدؓ، عبداللہ بن ثعلبہؓ، ابوالطفیلؓ، عامر بن واصلہؓ اور حضرت ابوجحیفہؓ وغیرہ کا شمار اسی طبقہ میں ہے۔(۱)

روایت کے اعتبار سے درجات

باعتبار روایت حدیث کے صحابہ کے تین درجات کئے گئے ہیں، اول: مکثرین، جن کی روایات ہزار سے اوپر ہوں، دوسرے: مقسطین، جن کی روایات ہزار سے کم اور سو سے زیادہ ہوں، تیسرے: مقلین، جن سے سو سے کم حدیثیں منقول ہیں، مقسطین اور مقلین کی تعداد تو بہت ہے؛ البتہ مکثرین سات ہیں، اور ان کے نام اور مرویات کی تعداد اس طرح ہے :

- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ : ۵۳۷۴
- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما : ۲۶۳۰
- حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما : ۲۲۸۶
- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا : ۲۲۱۰
- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما : ۱۶۶۰
- حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما : ۱۵۴۰
- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ : ۱۱۷۰

فقہی اعتبار سے بھی بعض صحابہ مکثرین شمار کئے گئے ہیں، تاہم مسروقؒ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا علم چھ صحابہ میں جمع ہو گیا ہے، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، بعض نے حضرت ابوالدرداءؓ کی جگہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا ذکر کیا ہے، اور پھر ان چھ کا علم دو میں جمع ہو گیا: حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، امام شعبیؒ سے مروی ہے کہ ان میں حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کی آراء میں زیادہ موافقت پائی جاتی تھی۔(۲)

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ۲۹-۳۱۔ (۲) مجمع الزوائد: ۱۰/۲۰، مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ۔

صحابہ کے بارے میں احتیاط

اُمت میں حضرات صحابہ کرامؓ کا ایک خاص درجہ ومقام ہے؛ کیوں کہ ان ہی کے ذریعہ دین ہم تک پہنچا ہے اوران ہی کی قربانیوں اور جاں نثاریوں سے اسلام کا شجر طوبی پروان چڑھا ہے؛اسی لئے آپ ﷺ نے ان کو اُمت کا سب سے بہتر گروہ قرار دیا ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے عہد کے مسلمان بہترین مسلمان ہیں، پھر ان کے بعد آنے والے اور پھر وہ لوگ جوان کے بعد آئیں:''**خير القرون قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم**''۔(۱)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا :

> میرے صحابہ کو برا بھلا نہ کہو،اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے،اگر تم احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرو تو وہ ان کے ایک مُد؛ بلکہ اس کے نصف خرچ کرنے کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔(۲)

ایک اور روایت میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

> لوگو! میرے صحابہ کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، میرے بعد ان کو نشانہ نہ بناؤ،جس نے ان سے محبت کی، اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی، اور جس نے ان سے بغض رکھا،اس نے درحقیقت مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھا،جس نے ان کو اذیت پہنچائی اس نے مجھ کو اذیت پہنچائی اور جس نے مجھ کو اذیت پہنچائی اس نے اللہ تعالیٰ کو اذیت پہنچائی اور جس نے اللہ کو اذیت پہنچائی قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو پکڑ لے۔

اس لئے حضرات صحابہ کے بارے میں بہت احتیاط چاہئے اور ہمیشہ سوءِ کلام اور سوءِ گمان سے بچنا چاہئے ؛ چنانچہ اگر کوئی شخص صحابہ کی شان میں بدگوئی کرے تو اس کے فاسق العقیدہ ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ؛لیکن تکفیر میں اختلاف ہے،فقہاء احناف میں علامہ عبدالرشید طاہر البخاریؒ نے لکھا ہے کہ ''اگر کوئی رافضی شخص شیخین کی شان میں گستاخی کرے اور لعنت بھیجے تو وہ کافر ہے''(۳)ملاعلی قاریؒ نے بھی مشائخ سے اس طرح کی بات نقل کی ہے ؛ لیکن اس کو از روئے قواعد مشکل قرار دیا ہے،(۴)فقہاء مالکیہ میں علامہ دردیرؒ نے ایسے شخص کو کافر تو قرار نہیں دیا ہے ؛ لیکن صحابہ اور اہل بیت کی تنقیص کرنے والوں کو شدید تعزیز کا مستحق قرار دیا ہے۔(۵)

---

(۱) مقدمہ ابن صلاح:۱۲۷۔ (۲) مسلم،حدیث نمبر:۲۵۴۰، بخاری،حدیث نمبر:۳۶۷۳۔
(۳) خلاصۃ الفتاویٰ:۴/۳۸۱۔ (۴) دیکھئے:شرح فقہ اکبر:۲۲۹۔ (۵) الشرح الصغیر:۴/۴۴۴۔

علامہ صاوی مالکیؒ نے نقل کیا ہے کہ قول معتمد یہ ہے کہ خلفاء اربعہ کی اہانت یا تکفیر کی وجہ سے کفر کا فتویٰ تو نہیں لگایا جائے گا؛ البتہ تعزیر کی جائے گی؛ لیکن سحنون مالکیؒ نے خلفاء اربعہ کو کافر کہنے والوں کو مرتد قرار دیا ہے، نیز صاویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو تمام صحابہ کی تکفیر کرے، وہ بالاتفاق کافر ہے۔(۱)

غرض صحابہ کے معاملہ میں بے حد احتیاط مطلوب ہے؛ اسی لئے سلف نے مشاجرات صحابہ پر گفتگو کرنے سے بھی منع کیا ہے، افسوس کہ گذشتہ نصف صدی میں بعض ایسی کتابیں منظر عام آئی ہیں، جن میں ناحق صحابہ کے اختلاف کو زیر بحث لایا گیا ہے اور آخر میں یہ بحث کہیں تو ناصبیت کے درجہ کو پہنچ گئی ہے اور کہیں اس کی سرحد تشیع سے جاملی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا عمل خدمت نہیں؛ بلکہ بدخدمتی ہے، اور ایک ایسی راہ پر بے احتیاطی سے قدم رکھنا ہے، جو شیشہ سے زیادہ نازک اور بال سے زیادہ باریک ہے۔

آثار صحابہ

صحابہ نے جس طرح اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دین حق کی صیانت وحفاظت میں رسول اللہ ﷺ کی بھرپور نصرت وحمایت کی اور آپ ﷺ کی رفاقت کا حق ادا فرمایا، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی صحبت بافیض سے گہری بصیرت، دین کا فہم صحیح اور عمیق علم بھی حاصل کیا اور اس اعتبار سے بھی ان کا درجہ ومقام بعد میں آنے والی امت سے بدرجہا بلند وبالا ہے، اسی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا کہ صحابہ کے فتاوی اور اقوال وافعال کی قانونی حیثیت کیا ہے؟

شافعی نقطۂ نظر

اس سلسلہ میں فقہاء کے جو مذاہب نقل کئے گئے ہیں، ان کی تفصیل اس طرح ہے :

۱- کہا جاتا ہے کہ امام شافعیؒ کے قول جدید کے مطابق قول صحابی حجت نہیں: ''**الشافعي في الجديد أنه لا يجوز مطلقاً**'' (۲) لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام شافعیؒ کی طرف اس کی نسبت درست نہیں معلوم ہوتی، علامہ ابن قیمؒ نے بھی امام شافعیؒ کی طرف اس نسبت کو نادرست قرار دیا ہے۔(۳)

مصادر شریعت میں ایک آثار صحابہ بھی ہے، صحابہ کے ایسے فتاوی جو قیاس کے قبیل کے نہ ہوں، غالب گمان یہ ہے کہ وہ کسی سنت ہی پر مبنی ہوں گے؛ اس لئے فقہاء کے درمیان آثارِ صحابہ کے حجت ہونے اور نہ ہونے کے

---

(۱) حاشیہ صاوی علی الشرح الصغیر: ۴/۴۴۴-۴۴۳۔

(۲) نہایۃ السول للاسنوی: ۳۶۷۔

(۳) دیکھئے: إعلام الموقعین: ۴/۱۲۰-۱۲۱۔

سلسلہ میں اختلاف پیدا ہو گیا، امام شافعیؒ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ ابتداءً آثار صحابہ کو حجت مانتے تھے؛ لیکن بعد میں آپ کی رائے بدل گئی تھی اور آپ اس کو حجت تسلیم نہ کرتے تھے، امام نوویؒ نے امام شافعیؒ کے نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے، فرماتے ہیں :

> جب صحابی کی کوئی رائے ہو، دوسرے صحابہ سے اختلاف منقول نہ ہو اور صحابی کا وہ قول مشہور نہ ہوا ہو تو یہ اجماع نہیں ؛ لیکن کیا وہ حجت بھی ہے؟ اس سلسلہ میں امام شافعیؒ سے دو رائیں منقول ہیں، صحیح اور جدید قول یہ ہے کہ حجت بھی نہیں، قول قدیم کے مطابق حجت ہے، پس اگر ہم صحابہ کے ایسے اقوال کو حجت مان لیں تو وہ قیاس پر مقدم ہوگا...... اگر صحابہ کے درمیان اختلاف رائے ہو تو قول قدیم کے مطابق دونوں اقوال متعارض دلیل سمجھے جائیں گے اور ایک کو دوسرے پر اس بنیاد پر ترجیح دی جائے گی کہ صحابہ کی زیادہ تعداد کس رائے کی حامی ہے؟(۱)

اس عاجز کا خیال ہے کہ یہ بات جو امام نوویؒ نے کہی ہے اور عام طور پر علماء اُصول کے درمیان معروف ہے، محل نظر ہے اور خود امام شافعیؒ کی تحریروں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، امام شافعیؒ الرسالہ میں فرماتے ہیں :

> میں کہتا ہوں کہ ایک صحابی کے قول کی بھی اتباع کی جائے گی ، بشرطیکہ کتاب اللہ، سنتِ رسول، اجماع اور اس کے ہم درجہ حکم کا ماخذ یا قیاس نہ پایا جائے ؛ لیکن ایسا کم ہوتا ہے کہ کسی صحابی سے ایسی رائے منقول ہو کہ دوسرے صحابی نے اس سے اختلاف نہ کیا ہو۔(۲)

امام شافعیؒ کی کتاب الام جس کو ان کے قول جدید کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے، اس میں ایسے بہت سے ایسے احکام موجود ہیں، جن میں امام شافعیؒ نے محض آثار صحابہ سے استدلال کیا ہے، مثلاً : ان کے نزدیک یمین لغو کا مصداق وہ قسمیہ کلمات ہیں، جو بے ساختہ زبان پر آ جائیں اور اس کے لئے دلیل صرف حضرت عائشہؓ کا فتوی ہے: ''أما الذي نذهب إليه فهو ما قالت عائشة''(۳) بڑھاپے کی وجہ سے جو شخص روزہ نہ رکھ سکے، امام شافعیؒ اس پر فدیہ واجب قرار دیتے ہیں اور اس پر حضرت انسؓ کے عمل سے استدلال کرتے ہیں۔(۴)

اس لئے امام شافعیؒ کی طرف آثار صحابہ کو حجت نہ ماننے کی نسبت صحیح نظر نہیں آتی، اصل یہ ہے کہ امام شافعیؒ کسی حدیث نبوی کی موجودگی میں آثار صحابہ کو حجت نہیں سمجھتے :

---

(۱) شرح مہذب:۱/۵۸۔ (۲) الرسالۃ:۵۹۸۔ (۳) الأم:۷/۲۴۲۔ (۴) الأم:۷/۲۴۵۔

إن كان يروىٰ عمّن دون رسول الله حديث يخالفه لم التفت إلىٰ
ما خالفه وحديث رسول الله أولىٰ أن يؤخذ به ۔ (۱)

دوسری طرف صورت حال یہ تھی کہ امام شافعیؒ کو جن دو جماعت فقہاء — حنفیہ اور مالکیہ — سے سابقہ پیش آیا، وہ دونوں ہی بعض حالات میں آثار صحابہ کو خبر واحد پر ترجیح دے دیا کرتے تھے، امام شافعیؒ کو اس طریقۂ ترجیح سے سخت اختلاف تھا اور انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق اس پر شدید نقد کیا ہے، مثلاً حدیث میں ہے کہ پانچ وسق سے کم مقدار غلہ میں عشر واجب نہیں، احناف اس پر عامل نہیں ہیں اور اپنے موقف پر کتاب وسنت کے عموم اور بعض صحابہ کے آثار سے استدلال کرتے ہیں، امام شافعیؒ نے اس پر نقد کیا ہے۔ (۲)

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بلی کا جھوٹا ناپاک نہیں ہے، حنفیہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے اثر سے استدلال کرتے ہیں کہ بلی کے جھوٹے سے وضو مکروہ ہے، امام شافعیؒ نے اس کو حدیث کی مخالفت قرار دیا ہے۔ (۳)

اسی طرح کی تنقیدیں آپ نے مالکیہ پر بھی کی ہیں؛ بلکہ مالکیہ کے یہاں چوں کہ آثار صحابہ سے استدلال زیادہ ہے؛ اس لئے ان پر آپ کی تنقید کا لب ولہجہ بھی ذرا تیکھا ہے، فرماتے ہیں :

عن ابن عمر أنه كان إذا اغتسل من الجنابة نضح في عينيه الماء ، قال مالک : ليس عليه العمل ، قال الشافعي : هذا مما تركتم على ابن عمر ولم ترووا عن أحد خلافه ، فإذا وسعكم الترک على ابن عمر لغير قول مثله لم يجز لكم أن تقولوا قوله حجة على مثله ۔ (۴)

ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ جب غسل جنابت فرماتے تو آنکھوں میں بھی پانی بہاتے، امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ کی اس رائے پر عمل نہیں ہے، امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ یہ اس بات کی مثال ہے کہ تم لوگ ابن عمرؓ کی رائے کو چھوڑتے ہو؛ حالاں کہ کسی صحابی سے اس کی مخالف رائے بھی تم نے نقل نہیں کی ہے، تو جب تم ابن عمرؓ کی رائے کسی صحابی کے اختلاف کے بغیر ترک کر سکتے ہو تو پھر دوسرے صحابی کے مقابلہ ان کی رائے کو کیوں کر حجت قرار دے سکتے ہیں؟

---

(۱) الأم: ۷/۱۹۱، باب اختلاف مالک والشافعی۔ (۲) الأم: ۷/۱۹۴-۱۹۵۔
(۳) الأم: ۷/۱۴۷۔ (۴) الرسالۃ: ۷/۵۰۷۔

اس لئے اس عاجز کا خیال ہے کہ آثار صحابہ امام شافعیؒ کے نزدیک بھی حجت ہیں؛ البتہ اس کو خبر واحد پر ترجیح نہیں دی جاسکتی، واللہ اعلم۔

۲- دوسری رائے یہ ہے کہ اگر صحابی کی یہ رائے اس کے عہد میں مشہور ہوگئی ہو، تب وہ حجت ہوگی، ورنہ نہیں، امام غزالیؒ، علامہ آمدیؒ اور رازی وغیرہ نے امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔(۱)

مالکی و حنبلی نقطۂ نظر

۳- فقہاء حنابلہ سے اس سلسلہ میں مختلف اقوال منقول ہیں، قول راجح یہ ہے کہ صحابہ کا قول حجت ہے اور اس کی تقلید واجب ہے؛ چنانچہ علامہ نجم الدین طوفی حنبلی فرماتے ہیں :

الثاني : قول صحابي لم يظهر له مخالف حجة يقدم على القياس ويخص به العام ، وهو قول مالک وبعض الحنفية خلافا لأبي الخطاب وجديد الشافعي وعامة المتكلمين ۔ (۲)

طوفی کی صراحت سے معلوم ہوا کہ یہی حضرات مالکیہ کی بھی رائے ہے؛ چنانچہ اکثر اہل علم نے مالکیہ سے نقل کیا ہے کہ صحابی کے اقوال قیاس پر مقدم ہیں، یہی نقطۂ نظر حنفیہ میں ابوبکر جصاص رازیؒ اور ابوسعید بردعیؒ وغیرہ کا ہے، (۳) رازی نے بواسطہ کرخی نقل کیا ہے کہ میں امام ابو یوسفؒ کو بعض مسائل کے بارے میں دیکھتا ہوں کہ کہتے ہیں: قیاس تو یہ ہے؛ لیکن میں نے اس کو قول صحابی کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے :

القياس كذا إلا أني تركته للأثر وذٰلک الأثر قول واحد من الصحابة ۔ (۴)

حنفیہ کا نقطۂ نظر

۴- حنفیہ کی رائے میں کچھ تفصیل ہے :

(الف) جن مسائل میں قیاس واجتہاد کی گنجائش نہیں، ان میں صحابی کا قول بالاتفاق حجت ہے؛ کیوں کہ جب اس مسئلہ میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے تو ضرور صحابی نے یہ رائے کسی نص کی بنیاد پر قائم کی ہوگی؛ چنانچہ امام سرخسیؒ فرماتے ہیں :

---

(۱) نہایۃ السول: ۳۶۷۔ (۲) شرح مختصر الروضۃ: ۳/ ۱۸۵، نیز دیکھئے: الواضح فی اصول الفقہ لابن عقیل حنبلی: ۲/ ۳۸۔
(۳) الأحکام للآمدی: ۴/ ۲۰۱۔ (۴) أصول السرخسی: ۲/ ۱۰۵۔

ولا خلاف بين أصحابنا المتقدمين والمتأخرين أن قول الواحد من الصحابة حجة فيما لا مدخل للقياس في معرفة الحكم فيه ۔ (۱)

امام سرخسیؒ نے اس کی بہت سی مثالیں نقل کی ہیں، جیسے مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم کا ہونا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے جسے ہم نے لیا ہے، حیض کی کم سے کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہوگی، اس میں حضرت انسؓ کا قول لیا گیا ہے، نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہوگی، اس میں حنفیہ نے عثمان بن ابی العاصؓ کے قول کو لیا ہے، اپنی فروخت کی ہوئی چیز کو قیمت کی ادائیگی سے پہلے ہی خریدار سے کم قیمت پر خرید کرنا جائز نہیں، یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے اور حنفیہ نے اسے اختیار کیا ہے، کوئی شخص اپنی اولاد کو ذبح کرنے کی نذر مان لے تو اس کی جگہ اس کو بکرا ذبح کرنا چاہئے، یہ عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے، جس پر احناف کا عمل ہے۔ (۲)

(ب) جو مسائل قیاسی و اجتہادی ہوں تو اس میں صحابہ کے قول کی کیا حیثیت ہوگی ؟ اس سلسلہ میں اختلاف ہے، امام کرخی کی رائے ہے کہ ان مسائل میں صحابی کا قول حجت نہیں ؛ کیوں کہ ممکن ہے کہ صحابی نے یہ بات اپنے اجتہاد سے کہی ہو، اور ابوسعید بردعیؒ کے نزدیک ایسے مسائل میں بھی صحابی کا قول حجت ہے، اور وہ قیاس سے مقدم ہوگا۔

عام طور پر حنفیہ کا عمل ابوسعید بردعیؒ کے قول پر ہے، سرخسیؒ نے اس کی بہت سی مثالیں نقل کی ہیں، قیاس کا تقاضہ یہ تھا کہ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا، غسل جنابت اور وضو دونوں میں سنت ہو؛ لیکن احناف نے عبداللہ بن عباسؓ کے قول کی بنیاد پر ان کو غسل میں واجب اور وضو میں سنت قرار دیا، قیاس کا تقاضا ہے کہ خون زخم کے اوپر نکل آئے اور نہ بہہ پائے تو بھی وہ ناقض وضو ہو؛ لیکن عبداللہ بن عباسؓ کے قول کی وجہ سے قیاس کو چھوڑتے ہوئے اس کو ناقض وضو نہیں قرار دیا، مرضِ وفات میں وارث کے لئے دَین کا اقرار کیا جائے تو قیاس کا تقاضا ہے کہ جائز ہو؛ لیکن عبداللہ بن عمرؓ کے قول کی بناء پر اس اقرار کو نامعتبر قرار دیا گیا، اگر اس طرح خرید وفروخت کا معاملہ طے پائے کہ اگر خریدار نے تین دنوں تک قیمت ادا نہیں کی، تو معاملہ ختم ہو جائے گا تو قیاس کا تقاضہ ہے کہ یہ صورت جائز نہ ہو؛ لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ کے قول کی بناء پر ہم نے اس معاملہ کو درست قرار دیا ہے۔ (۳)

---

(۱) أصول السرخسي: ۱۱۰/۲۔

(۲) أصول السرخسي: ۱۱۰/۲۔

(۳) أصول السرخسي: ۱۰۶/۲۔

حقیقت یہ ہے کہ خود امام ابوحنیفہؒ سے ان کے طریقۂ اجتہاد کی جو تفصیل منقول ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کتاب وسنت کے بعد صحابہ کے فتاوی کو مطلقاً حجت مانتے تھے اور ایک مستقل دلیل شرعی کی حیثیت سے اس کو پیش نظر رکھتے تھے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> میں اولاً کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں، اس میں نہ ملے تو حدیث کی طرف، دونوں میں نہ ملے تو صحابہ کے اقوال سے اخذ کرتا ہوں، ان میں سے جن کی رائے چاہتا ہوں قبول کرتا ہوں، اور جسے چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، اور ان کے اقوال سے کسی دوسرے کی طرف رجوع نہیں کرتا، پھر جب معاملہ ابراہیم نخعی، شعبی، ابن سیرین، حسن، عطاء اور سعید بن مسیب تک پہنچتا ہے، تو وہ بھی اجتہاد کرتے تھے، اور میں بھی اجتہاد کرتا ہوں۔(۱)

اسی سے ایک دوسرا مسئلہ یہ متعلق ہے کہ اگر کوئی حدیث عام ہو تو کیا صحابی کے قول وفعل سے اس میں تخصیص ہوسکتی ہے، یعنی بعض افراد کا اس حکم سے استثناء کیا جاسکتا ہے، اس سلسلہ میں دو نقاط نظر ہیں، ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ چوں کہ قول صحابی بھی حجت ودلیل ہے؛ اس لئے اس کی وجہ سے حدیث کے عمومی حکم میں تخصیص کی جاسکتی ہے، دوسری رائے اس کے برخلاف ہے، (۲) دوسرا قول امام شافعیؒ وغیرہ کا ہے اور پہلا احناف اور حنابلہ کا، (۳) امام مالکؒ کے طریقۂ اجتہاد سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ قول صحابی کی بناء پر حدیث کے عمومی مفہوم میں تخصیص کو درست سمجھتے تھے، یہ ایک بنیادی اور اہم مسئلہ ہے اور اس سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے کم علم لوگوں کو ائمہ مجتہدین کے بارے میں غلط فہمی ہوتی ہے، اور صحابہ کے اقول وفتاویٰ پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کی رائے کو خود رائی پر مبنی تصور کرنے لگتے ہیں، اگر یہ پہلو ذہن میں رہے کہ صحابہ نے براہ راست رسول اللہ ﷺ سے دین کو حاصل کیا ہے اور وہ ورع وتقویٰ اور خشیت الٰہی میں پوری اُمت پر فائق ہیں؛ اس لئے اگر کسی حکم شرعی سے واقف ہونے کے باوجود ان کا فتویٰ یا عمل بظاہر اس کے خلاف جاتا ہو تو ضرور ہے کہ انھوں نے حضور ﷺ سے سیکھ کر اور آگہی حاصل کر کے ہی یہ عمل کیا ہوگا، تو وہ بدگمانی پیدا نہ ہو، جس میں آج کل مسلمانوں کا ایک کم علم گروہ مبتلا ہے۔

---

(۱) تاریخ بغداد: ۳۶۸/۱۳۔

(۲) الواضح فی اصول الفقہ: ۴۱/۲۔

(۳) الإحکام فی أصول الأحکام: ۳۵۸/۲۔

مثلاً: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب نماز کھڑی ہوجائے تو اس فرض کے سوا کوئی اور نماز نہ پڑھی جائے؛ لیکن حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ کے بارے میں صحیح حدیثیں موجود ہیں کہ انھوں نے مسجد کے دروازہ پر یا مسجد کے کسی گوشے میں یا صفوں سے ہٹ کر نماز ادا فرمائی، پھر جماعت میں شریک ہوئے؛(1) چنانچہ حنفیہ اور بعض دوسرے فقہاء نے ان صحابہ کے آثار کی بنیاد پر یہ رائے قائم فرمائی کہ اگر جماعت کے بالکلیہ فوت ہوجانے کا اندیشہ نہ ہو تو جماعت کی جگہ سے ہٹ کر سنتِ فجر کا ادا کرلینا بہتر ہے۔

اسی طرح حدیث میں جمعہ کی فرضیت کا حکم عام ہے؛ لیکن حضرت علیؓ کا فتوی موجود ہے کہ جمعہ وعیدین شہر سے متعلق عبادتیں ہیں؛ چنانچہ حنفیہ نے اسی بنیاد پر نماز جمعہ کے لئے شہر کی شرط لگائی ہے، یہ حدیث کے مقابلہ رائے پر عمل کرنا نہیں ہے؛ بلکہ قول صحابی — جو خود بھی حدیث کے درجہ میں ہے — کی بنیاد پر حدیث کے ایک عمومی حکم میں تخصیص ہے اور یہ اس حسن ظن کی بنیاد پر ہے کہ یہ جماعتِ صحابہؓ براہ راست رسول اللہ ﷺ کی تربیت یافتہ ہے؛ اس لئے ان کے اقوال وافعال منشأ نبوی ﷺ کے ہی ترجمان ہیں ''رضی اللہ تعالیٰ عنہم ورضوا عنہ''۔

• • •

(1) دیکھئے: آثار السنن، باب من قال یصلی سنۃ الفجر عند اشتغال الامام بالفریضۃ خارج المسجد۔

فتویٰ وقضاء میں فرق اور مسئلہ طلاق میں بے احتیاطی

مولانا عبد اللہ ممتاز قاسمی ☆

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو تا قیامت انسانوں کی رہنمائی کے لئے بر پا کیا ہے، اس کے انفرادی، خاندانی، معاشرتی، ملکی اور سیاسی زندگی میں دائمی وآفاقی انتہائی منظم ومستحکم اصول موجود ہیں؛ لیکن بہت سی مرتبہ ہمارے ان اُصولوں کے صحیح انطباق نہ کر سکنے کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور بہت سی خرابیاں رونما ہوتی ہیں؛ خصوصاً رہنمایان دین وشریعت کی ذرا سی چوک اُمت میں سخت تباہی وبربادی کا ذریعہ بنتی ہے۔

دنیا کے اندر صدیوں تک اسلامی حکومت رہی ہے اور مسلم حکام اپنی کوتاہیوں کے باوجود اپنے عدالتی نظام کو اسلامی آئین وضوابط کے تحت چلاتے رہے ہیں، خلافت راشدہ، خلافت بنوامیہ اور خلافت عباسیہ وفاطمیہ ہر دور میں دارالقضاء کا مضبوط سسٹم رہا ہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ خلافت عثمانیہ کے سنہرے دور کے بعد ختم ہو گیا، جب خلافت ختم ہوئی تو دارالقضاء کا اسلامی نظام بھی جاتا رہا؛ چنانچہ حضرات مفتیان کرام نے قاضیوں کی ذمے داریاں بھی سنبھالنی شروع کردیں جس کی وجہ سے ''فتویٰ وقضاء کا فرق'' جاتا رہا اور فقہی کتابوں میں جو مسائل قضاء کے لئے لکھے گئے تھے، حضرات مفتیان کرام نے ان کے مطابق فتوی دینا شروع کر دیا، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں :

> والمُفْتُونَ اليوم غافلون عنه ، فإن أكثرهم يفتونَ بأحكامِ القضاء ، ووجه الابتلاء فيه : أن المذكور فى كتب الفقه عامةً هو مسائل القضاء ، وقَلَّما تُذكرُ فيها مسائلُ الدِّيانة ، نعم ، تذكر تلك فى المبسوطات ، ولا تُنَال إلا بعد تدرُّبٍ تامٍ ، ولعل وجهته أن القاضى فى السلطنة العثمانية لم يكن ينصبُ إلا حنفيًا ، بخلاف المفتيين فإنهم كانوا من المذاهب الأربعة ، وكان القاضى الحنفى يُنَفِّذُ ما أفتُوا به ، فشرع المُفْتُونَ تحرير

☆ استاذ: شعبۂ عربی زبان وادب واسلامیات فلینے مالدیپ۔

حکم القضاء لینفِّذ القاضی ، فاشتهرت مسائل القضاء فی الکتب ، وخملت مسائل الدیانة ، ثم لا یجبُ أن تتفقَ الدیانة والقضاء فی الحکم بل قد یختلفان ۔ (۱)

آج کے مفتی حضرات اس (فتویٰ و قضاء کے فرق) سے غافل ہیں؛ چنانچہ اکثر مفتیان احکام قضاء کے مطابق فتویٰ دے رہے ہیں، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ متوسط فقہی کتابوں میں عام طور سے قضائی احکام لکھے ہوئے ہیں اور بہت کم دیانت (فتویٰ) کے مسائل کا ذکر ہے، ہاں مبسوطات میں دیانت کے مسائل کا ذکر ہے؛ لیکن ان (کتابوں کے مسائل دیانت) کو مکمل مشق وتمرین سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے، (قضاء کے مطابق فتویٰ کے چلن کے عام ہوجانے کی) وجہ شاید یہ ہے کہ عثمانی سلطنت میں قاضی کے عہدے پر صرف حنفی مامور ہوا کرتے تھے، جب کہ مفتیان مذاہب اربعہ کے تھے، اس لئے حنفی قضاۃ ان مفتیوں کے فتوے کے مطابق فیصلہ کردیا کرتے تھے؛ چنانچہ مفتیوں نے قضاء کے احکام لکھنا شروع کردیا؛ تاکہ قاضی اس حکم قضائی کو نافذ کریں، اس طرح کتابوں میں قضاء کے مسائل عام ہوتے چلے گئے اور دیانت (فتویٰ) کے مسائل ختم ہوتے چلے گئے، جب کہ ہمیشہ قضاء اور دیانت کا حکم شرعی یکساں نہیں ہوتا، بہت سی مرتبہ دونوں کے احکام مختلف ہوتے ہیں۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ متاخرین کے دور میں قاضیوں کا علمی معیار گر گیا تھا، قضاۃ کی تقرریاں علمی بنیاد پر کم اور قرابت داری کی بنیاد پر زیادہ ہونے لگی تھی اس لئے متاخرین نے قاضی کے فیصلے کو فتوی کے تابع کردیا؛ تاکہ قاضی اپنی کم علمی کی وجہ سے کچھ غلط فیصلہ نہ کردے، شامی نے لکھا ہے: ''القضاء تابع للفتوی فی زماننا لجهل القضاة'' کہ قاضیوں کی جہالت کی وجہ سے اس زمانے میں قضاء فتویٰ کے تابع ہے یعنی مفتی قضائی حکم لکھ دیتا تھا اور قاضی اس حکم کی تنفیذ کرتا تھا، یہ چلن اتنا عام ہوگیا تھا اور اتنے دھڑلے سے مفتیان قضائی حکم فتویٰ میں لکھنے لگے تھے کہ شامی کو فتاوی شامی میں کئی بار توجہ دلانی پڑی کہ عام لوگ جب مسئلہ دریافت کرنے آئے تو مفتی کے لئے ضروی ہے کہ دیانت کے مطابق فتویٰ دے؛ البتہ اس فتویٰ میں ''لا یصدق قضاءً'' کی صراحت کردے کہ دارالقضاء میں اس فتوے کا اعتبار نہ کیا جائے تاکہ قاضی اس فتویٰ کی روشنی میں غلط فیصلہ نہ کردے:

(۱) فیض الباری علی صحیح الباری: ۱/ ۲۷۲۔

(و إذا كتب المفتى يدين) أى كتب هذ اللفظ بأن سئل مثلا عمن حلف واستثنى ولم يسمع أحدا يجيب أى لا يحنث فيما بينه وبين ربه ولكن يكتبه بعده ''ولا يصدق قضاءً'' لأن القضاء تابع للفتوى فى زماننا لجهل القضاة فربما ظن القاضى أنه يصدق قضاء ا أيضا ۔ (۱)

تتبع وتلاش سے ایسے ڈھیر سارے مسائل ہمارے سامنے آئیں گے؛ جن میں قضاء ودیانت کا فرق نہیں کیا جا رہا ہے اور اس بات کے قائل علامہ کشمیریؒ جیسی شخصیت ہیں؛ لیکن آج ہم معاشرہ کی بیخ کنی کرتے انتہائی سنگین وحساس مسئلہ یعنی طلاق کے حوالے سے قضاء ودیانت کا فرق نہ کرنے کی وجہ سے ہورہی بے احتیاطیوں پر گفتگو کریں گے، آیئے سب سے پہلے ہم دیانت وقضاء میں فرق سمجھتے ہیں!

فتویٰ احکام شرعیہ کے متعلق إخبار محض کا نام ہے، علامہ قرافیؒ لکھتے ہیں :

الفتوى محض إخبار عن الله تعالىٰ فى إلزام أو إباحة ۔ (۲)

لہٰذا مفتی کی ذمہ داری بس صورتِ مسئولہ کے مطابق حکم شرعی بتا دینا ہے، قطع نظر اس کے کہ صورتِ مسئولہ نفس الامر کے مطابق ہے یا خلاف، شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں :

يقول المفتى ''الحكم فى الصورة المسؤل عنها كذا'' ولا يلزم منه ان تكون الصورة المسؤل عنها موافقة للواقع فى نفس الامر ۔ (۳)

قاضی نفس الامر اور وجود خارجی کو جاننے کا مکلف ہے جب کہ مفتی کا یہ کام قطعی نہیں ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے لکھا ہے :

القاضى الحاكم يحتاج إلى معرفة المسائل والوقائع أيضا بخلاف المفتى ۔ (۴)

---

(۱) شامی: ۶/۴۲۱۔

(۲) انوار البروق فی انواء الفروق: ۴/۸۹۔

(۳) أصول الافتاء وآدابہ: ۱۲۔

(۴) العرف الشذی شرح سنن الترمذی: ۳/۶۹۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ قضاء کا اپنا میدان ہے اور دیانت یعنی فتویٰ کا اپنا میدان ہے، دونوں کو اپنے حدود میں رہنا اوران کی پاسداری کرنا چاہئے، متعدد فقہاء نے لکھا ہے کہ قاضی کے لئے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے اوراس پر تقریباً تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ جو معاملہ قاضی کے زیر سماعت ہو اس مسئلہ میں قاضی کے لئے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے، ایسے ہی مفتی حضرات کے لئے قضاء کے میدان میں جانا اور دیانت سے بڑھ کر قضائی احکامات کے مطابق فتویٰ دینا درست نہیں ہے، اصل مسئلہ پر جانے سے پہلے بطور تمہید چند باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

ایک مجلس میں ایک سے زائد طلاق کی دو شکلیں ہیں۔

اول : کوئی یوں کہے: ''میں نے تم کو تین طلاق دی'' یا ''ایک طلاق دو طلاق تین طلاق''۔

دوم : تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ دے۔

اول الذکر سے تین طلاق واقع ہوجائے گی، اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، اس میں کوئی کلام نہیں، ثانی الذکر کی تین شکلیں ہیں :

اول : ''طلاق طلاق طلاق'' کہے اور تاسیس/ استیناف کی نیت کرے یعنی ہر مرتبہ طلاق میں نئی طلاق کی نیت کرے۔

دوم : ''طلاق طلاق طلاق'' کہے اور تاکید کی نیت کرے، یعنی اس کی نیت تو ایک ہی طلاق کی ہے؛ البتہ دوسری اور تیسری طلاق کے تکرار سے طلاق کو مؤکد کرنا مقصد ہے۔

سوم : ''طلاق طلاق طلاق'' کہے اور اس کی نیت تاسیس یا تاکید میں سے کچھ بھی نہ تھی۔

اس میں بھی شکل اول میں تین طلاق واقع ہوجائے گی، ہماری گفتگو آخری شکل میں مذکور دوسری اور تیسری شکل پر ہوگی، یعنی تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہے اور نیت ایک طلاق کی تھی یا نیت کچھ بھی نہ تھی۔

رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے ابتدائی دو سالوں تک ایسی طلاق جو تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ دی جاتی تھی ایک طلاق سمجھی جاتی تھی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چلن بدل جانے اور دیانت کے کم ہوجانے کی وجہ سے اس پر بندش لگادی اور فرمایا کہ تین مرتبہ کہی ہوئی طلاق تین طلاق شمار ہوگی، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کیا ہے :

كان الطلاق على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ، وأبي بكر ،

وسنتين من خلافة عمر ، طلاق الثلاث واحدة ، فقال عمر بن الخطاب : إن الناس قد استعجلوا فى أمر قد كانت لهم فيه أناة ، فلو أمضيناه عليهم ، فأمضاه عليهم ۔ (۱)

معروف شارح مسلم امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

فالأصح أن معناه أنه كان فى أول الأمر إذا قال لها أنت طالق أنت طالق أنت طالق ولم ينو تأكيدا ولا استئنافا يحكم بوقوع طلقة لقلة إرادتهم الاستئناف بذلك فحمل على الغالب الذى هو إرادة التأكيد فلما كان فى زمن عمر رضى الله عنه وكثر استعمال الناس بهذه الصيغة وغلب منهم إرادة الاستئناف بها حملت عند الإطلاق على الثلاث عملا بالغالب السابق إلى الفهم منها فى ذلك العصر وقيل المراد أن المعتاد فى الزمن الأول كان طلقة واحدة وصار الناس فى زمن عمر يوقعون الثلاث دفعة فنفذه عمر ۔ (۲)

اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ شروع زمانے میں جب کوئی ''انت طالق، انت طالق، انت طالق'' (تمھیں طلاق ہے، تمھیں طلاق ہے، تمھیں طلاق ہے) کہہ کر طلاق دیتا اور تاکید واستیناف (نئی طلاق کے وقوع) کسی بھی چیز کی نیت نہ کرتا تو ایک طلاق کے وقوع کا حکم لگتا تھا؛ کیوں کہ لوگ ان الفاظ سے بہت کم استیناف (نئی طلاق کے ایقاع) کا ارادہ کرتے تھے؛ لہٰذا ان الفاظ کو ان عام معمول پر محمول کیا جاتا جسے تاکید کہا جاتا ہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور طلاق کے لئے ان الفاظ کا استعمال بکثرت ہونے لگا اور عام طور سے ان کی نیت استیناف کی ہوتی تھی؛ چنانچہ مطلق تین مرتبہ (طلاق طلاق طلاق کہنے) کو تین طلاق پر محمول کیا گیا اسی سابقہ غالب معمول پر عمل کرتے ہوئے۔

---

(۱) صحیح مسلم: ۱۰۹۹/۲۔

(۲) شرح النووی علی مسلم: ۷۲/۱۰۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ قضائی معاملہ کے لیئے تھا، دیانت کے لئے قطعاً نہیں تھا؛ چوں کہ قاضی کا کام ظاہر کے مطابق حکم شرعی لگانا ہے، اوراس نے تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ دی ہے تو ظاہر یہی ہے کہ اس نے تین طلاق دی ہوگی؛ لیکن مفتی کا کام دیانت کے مطابق فتویٰ دینا ہے، وہ قضائی حکم کے مطابق فتویٰ نہیں دے سکتا؛ اس لئے اگر کسی نے تین مرتبہ طلاق طلاق طلاق کہہ دی تو مفتی کے لئے مطلق تین طلاق کا فتویٰ لکھ دینا درست نہیں ہے۔

اب آیئے ہم ہندوستانی و پاکستانی معاشرہ کی صورت حال اور چلن کو دیکھتے ہیں!

یہاں عام چلن ہے کہ نکاح کے وقت نکاح خواں تین مرتبہ قبول کراتا ہے ''قبول ہے قبول ہے قبول ہے'' کے الفاظ سے، اس لئے کم پڑھے اور اَن پڑھ لوگوں میں یہ سوچ ہے کہ جب تک تین مرتبہ طلاق طلاق طلاق نہیں کہیں گے طلاق واقع نہیں ہوگی؛ چوں کہ تین مرتبہ قبول کیا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ فلمی کہانیاں اور ڈرامے معاشرے کو دیکھ کر بنتی ہیں یا فلموں سے متاثر ہو کر معاشرہ بنتا ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ فلموں اور سیریلوں کا معاشرہ سے ڈائریکٹ کنکشن (رابطہ) ہے، گو کہ فلم بینی حرام ہے؛ لیکن اس نے ہمارے معاشرے کو بھی متاثر کیا ہے، فلموں اور سیریلوں میں طلاق کا تصور یہی دیا اور سمجھایا گیا ہے کہ جب تک تین مرتبہ طلاق طلاق طلاق نہ کہی جائے طلاق واقع نہیں ہوتی۔

شاید ہی کہیں ایسا ہوتا ہے کہ نارمل حالت میں طلاق دی گئی ہو ورنہ عام طور سے غصہ کے عالم میں ہی طلاق کی نوبت آتی ہے، ایسے میں انسان بس ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ دیتا ہے، اس کی نیت استیناف یا تاکید کی نیت نہیں ہوتی ہے۔

ان صورت حال کو جاننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں :

1- اگر کوئی تین مرتبہ ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ دے اور معاملہ دارالقضاء آئے تو قاضی ثبوت وشواہد کی روشنی میں صورت حال کا جائزہ لے کر اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کریں، اگر فیصلہ میں خطا ہو بھی گیا تو وہ ایک اجر سے محروم نہیں ہوں گے۔

2- اگر معاملہ دارالافتاء آئے اور وہ بصراحت کہے کہ میری نیت ایک کی تھی تو ایک طلاق واقع ہوگی۔

3- اگر معاملہ دارالافتاء آئے اور استفتاء میں اپنی نیت استیناف/ تاکید کی صراحت نہ ہو تو مفتی اس نیت کی وضاحت طلب کرے اور مستفتی کی وضاحت کے مطابق فتوی دے یعنی اگر وہ تاکید کی نیت بتائے تو تاکید اور استیناف کی نیت بتائے تو استیناف۔

4- اگر معاملہ دارالافتاء آئے اور وضاحت طلب کرنے پر جواب آئے کہ ''میری کوئی نیت نہ تھی، بس تین بار طلاق طلاق طلاق کہہ دی'' تو اسے معاشرہ کی صورت حال کی وجہ سے ایک طلاق سمجھی جائے اور ایک طلاق کا فتویٰ دیا جائے، جیسا زمانۂ نبوی، خلافتِ صدیقی اور خلافتِ فاروقی کے ابتدائی دو سالوں میں ہوتا رہا ہے۔

پیدا ہونے والے اشکالات کے جوابات

نمبر پر ایک پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا فیصلہ اگر قضائی تھا تو پھر موجودہ وقت کے قضاۃ حضرات کو اپنی صوابدید کے مطابق وقوع اور عدم وقوع طلاق کے فیصلہ کا اختیار کیسے دیا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو وقوع طلاق کا فیصلہ کیا تھا اس کی دو وجہ تھی: (۱) چلن کا بدل جانا، (۲) دیانت کا کم ہوجانا۔

موجودہ حالات میں دیانت کی کمی تو دور عمری سے ہزار گنا زائد ہے؛ لیکن ہمارے یہاں دینی شعور کی کمی اور جہالت کی وجہ سے چلن پھر سے بدل چکا ہے اور چلن بدل جانے کی وجہ سے قاضی رواج کے مطابق فیصلہ کرسکتا ہے، مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے :

> اور اگر طلاق دینے والا یہ کہتا ہے کہ اس کی نیت ایک ہی طلاق کی تھی اور اس نے محض زور پیدا کرنے کے لئے الفاظ طلاق دُہرائے ہیں، اس کا مقصد ایک سے زائد طلاق دینا نہیں تھا تو اس کا یہ بیان حلف کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا اور ایک ہی طلاق واقع ہوگی اور اگر طلاق دینے والا یہ کہتا ہے کہ اس کی کچھ بھی نیت نہیں تھی، نہ ایک کی اور دو یا تین کی، دیکھا جائے گا کہ عرف میں ایسے مواقع پر تاکیداً الفاظ دُہرانے کا رواج ہے یا نہیں، اگر عرف غالب یہ ہو کہ ایسے مواقع پر لوگ محض کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے بار بار اسی لفظ کو دُہراتے ہیں تو عرف کے تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے الفاظ کی تکرار کو تاکید پر محمول کرکے ایک ہی طلاق واقع کی جائے گی۔(۱)

چنانچہ بینہ وثبوت اور عرف کو ملحوظ رکھ کر قاضی ایک یا تین کا فیصلہ کرسکتے ہیں، اگر وہ مصیب ہوئے تو دو اجر کے مستحق ہوں گے اور اگر مخطی ہوئے تو ایک اجر کے، ارشاد نبوی ہے :

> إذا حكم الحاكم فاجتهد فأصاب ، فله أجران ، و إذا حكم فأخطأ ، فله أجر واحد ۔ (۲)

---

(۱) مجموعہ قوانین اسلامی: ۱۹۴۔ (۲) ترمذی: ۱۳۲۶۔

نمبر دو اور تین پر حضرات مفتیان کرام کی طرف سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ اس طرح لوگ تین کی نیت سے طلاق دیں گے اور ایک کا فتویٰ حاصل کرلیں گے، جواب بڑا سادہ اور سیدھا ہے کہ ہمارا تو کام ہی ''اِخبارِ محض'' ہے، اس نے زبان یا تحریر سے جیسا بتایا ہمارا کام اس کے مطابق فتویٰ دے دینا ہے، اب معاملہ فیما بینہ وبین اللہ ہے، اگر اس نے جھوٹ بول کر آپ سے فتویٰ حاصل کیا ہے یعنی اس کی نیت استیناف کی تھی اور ''تاکید کی نیت یا بلا نیت'' کہہ کر ایک طلاق کا فتویٰ حاصل کرلیا تو یقیناً اس کا مؤاخذہ آپ سے نہیں ہوگا، عنداللہ اس کا جوابدہ وہ خود ہوگا؛ لیکن اگر اس کی نیت وہی تھی جو وہ زبان سے کہہ رہا ہے یعنی تاکید کی تھی یا بلا نیت تھی اور آپ نے تین طلاق کا فتویٰ لکھ کر اس کے گھر کو توڑ دیا، ان کے بچوں کو بکھیر دیا اور طلاق کی وجہ سے جو انتہائی خطرناک اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ ان کی زندگی پر ہوئے تو یقیناً کہیں نہ کہیں اس جرم میں آپ کا شمار ہوگا اور اس طلاق کی وجہ سے ہونے والے تمام تر برے اثرات کے آپ ذمہ دار ہوں گے اور اس کے لئے عنداللہ جوابدہ ہونا پڑے گا، جان لیجیے! اسے ''اجتہادی خطا'' کہہ کر بھی نہیں ٹالا جاسکے گا، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے حدیث: ''إذا حکم الحاکم فاجتهد فأصاب، فله أجران، و إذا حکم فأخطأ، فله أجر واحد''(۱) کے متعلق عقد الجید شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حوالے سے حاشیہ لکھا ہے:

> إن حدیث الباب فی حق القاضی لا فی حق المفتی أو المجتهد والقاضی الحاکم یحتاج إلی معرفة المسائل والوقائع أیضاً بخلاف المفتی ۔ (۲)
>
> حدیث مذکور قاضی کے حق میں ہے نہ کہ مفتی یا مجتہد کے حق میں (کہ اگر وہ مصیب رہا تو دوگونا اجر اور اگر مخطی رہا تو ایک گونا اجر) چوں کہ قاضی مسائل جاننے کے ساتھ تحقیق واقعہ کا بھی مکلف ہے، برخلاف مفتی کے (کہ انھیں تحقیقِ واقعہ کی ضرورت نہیں، ان کے لئے مسائل کا علم کافی ہے)۔

نمبر دو والی شکل کو اگر آپ بغور دیکھیے تو اس مسئلہ کو لے کر دارالافتاء آنے والے ہر شخص کو آپ جھوٹا اور فریبی فرض کر کے فتویٰ لکھتے ہیں، یعنی جتنے بھی آدمی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آئے اور وہ آپ سے فتویٰ طلب کرے گو کہ وہ سچا اور دین دار آدمی ہے، خوف خدا کی وجہ سے دارالافتاء آیا ہے؛ لیکن آپ بلا کسی دلیل کے اسے جھوٹا مان لیتے ہیں کہ یقیناً یہ جھوٹ بول رہا ہے اور پھر قضاء کے مطابق تین طلاق کا فتویٰ لکھ دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ اُصولِ فتویٰ اور اُصولِ شریعت دونوں کے خلاف ہے۔

---

(۱) ترمذی: ۱۳۲۶۔ (۲) العرف الشذی شرح سنن الترمذی: ۶۹/۳۔

نمبر دو پر ہونے والے اعتراض کا واضح جواب یہ بھی ہے کہ اس اندیشہ کو تمام اہل مراجع نے محسوس نہیں کیا؛ بلکہ انھوں نے بصراحت لکھا کہ اگر مستفتی اقرار کرتا ہے کہ اس نے تین مرتبہ طلاق طلاق طلاق کہی ہے؛ لیکن نیت ایک کی تھی تو مفتی ایک طلاق کے وقوع کا ہی فتویٰ دے گا۔

نمبر چار پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ زمانۂ نبوی اور خلافتِ صدیقی میں چوں کہ تین مرتبہ طلاق طلاق طلاق کہنے کے باوجود ایک کی نیت کا ہی چلن تھا جیسا کہ امام نوویؒ کی عبارت سے واضح ہے؛ لیکن اب ایسی صورت حال نہیں ہے، اس کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے کہ زمانہ اب بھی وہی ہے، اب بھی لوگ تین مرتبہ طلاق طلاق طلاق کہہ کر ایک طلاق واقع ہونا ہی سمجھتے ہیں، بس ایسا سمجھنے کی وجہ میں فرق ہے، قرن اول میں ایمان کی پختگی، شرعی علوم سے گہری واقفیت اور عنداللہ جوابدہی کے خوف سے ایسا چلن تھا، اب جہالت، شرعی علوم سے ناواقفیت اور فلم وسیریل بینی کے اثر سے ایسا چلن ہے، بہر حال نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کی صورت حال برابر ہے اس لئے حکم شرعی بھی برابر لگنی چاہئے، یعنی جو حکم پہلے لگتا تھا وہی حکم اب بھی لگنا چاہئے، مجموعہ قوانین اسلامی کا حوالہ گزر چکا ہے۔

اسی قبیل سے جھوٹی طلاق کے اقرار کا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے اس ارادے کے ساتھ کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے کہہ دے کہ ''میں تمھیں طلاق دے چکا ہوں'' یا کسی نے اس کی بیوی کو زبردستی طلاق دلانے یا طلاق نامہ پر دستخط کرانے کی کوشش کی اور اس نے جھوٹ کہہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو پہلے ہی طلاق دے چکا ہے تو دیانۃً اس کی بیوی پر طلاق واقع نہ ہوگی، یعنی مفتی حضرات وقوع طلاق کا فتویٰ نہیں دے سکتے؛ البتہ اگر معاملہ دارالقضاء جاتا ہے تو ثبوت وشواہد کی روشنی میں قاضی طلاق واقع کردے گا، فتاویٰ شامی میں ہے :

> المفتی یفتی بالدیانة مثلا إذا قال رجل : قلت لزوجتی أنت طالق قاصدا بذلک الإخبار کاذبا فإن المفتی یفتیه بعدم الوقوع والقاضی یحکم علیه بالوقوع ۔ (۱)
>
> مفتی کا کام دیانت کے مطابق فتویٰ دینا ہے؛ چنانچہ اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا: ''انت طالق'' (تم مطلقہ ہو/تم کو طلاق دے چکا ہوں) اس ارادے کے ساتھ کہ وہ جھوٹی خبر دے رہا ہے تو مفتی عدم وقوع طلاق کا فتویٰ دے گا اور (اگر معاملہ دارالقضاء جاتا ہے تب) قاضی وقوع طلاق کا فیصلہ کرے گا۔

(۱) ردالمحتار: ۵/۳۶۵۔

کسی نے اپنی بیوی کو ہنسی مذاق میں کہہ دیا کہ ''میں تمھیں طلاق دے چکا ہوں'' یا اپنے دوستوں کی مجلس میں تفریحاً اقرار کیا کہ میں تو بیوی کو طلاق دے چکا ہوں تب بھی اس پر دیانۃً (فتویٰ کی رو سے) طلاق واقع نہ ہوگی :

ولو أقر بالطلاق کاذبا أو هازلا وقع قضاء لا دیانة ۔ (۱)

مذکورہ بالا دونوں مسائل میں بھی دارالافتاء سے وقوع طلاق کے فتاوے صادر ہوتے ہیں اور ان کی مضبوط دلیل رسول اللہ ﷺ کا فرمان :

ثلاث جدهن جد ، وهزلهن جد : النكاح ، والطلاق ، والرجعة ۔ (۲)

جب کہ اس روایت کے حوالے سے ''انشاء طلاق اور اخبار طلاق میں فرق'' اور اس کی وجہ سے قضاء و دیانت کا فرق کرنا بھول جاتے ہیں، یعنی اگر انشاء طلاق ہنسی مذاق میں بھی واقع ہوجاتی ہے، مثلاً: ہنسی مذاق میں یوں کہہ دے کہ ''میں تمھیں طلاق دیتا ہوں'' تو طلاق واقع ہوجائے گی؛ لیکن اگر ہنسی مذاق میں اقرار طلاق کرلے کہ میں تمھیں طلاق دے چکا ہوں تو فتویٰ کی رو سے طلاق واقع نہ ہوگی؛ البتہ قضاء کی رو سے طلاق واقع ہوجائے گی، (۳) چوں کہ اگر ہنسی مذاق میں بھی کئے گئے اقرار کی بناء پر نکاح، طلاق اور رجعت کے احکام قضا کے اعتبار سے نافذ نہ کئے گئے تو معاملات خراب ہوجائیں گے اور قاضی کے لئے فیصلہ کرنا دشوار ہوجائے گا؛ کیوں کہ وہ ظاہر کے مطابق حکم لگانے کا مکلف ہے، اس کا مقصد ہزل تھا یا جد، اپنے قول میں وہ سچا تھا یا جھوٹا اس سے قاضی کو کوئی مطلب نہیں؛ چنانچہ اگر کسی شخص نے دو آدمی کو پہلے سے گواہ بنادیا کہ میں اپنی بیوی کو جھوٹی طلاق کی خبر دوں گا تم گواہ رہو اور بیوی کو جھوٹی طلاق کی خبر دیدی کہ ''میں تمھیں طلاق دے چکا ہوں/تم مطلقہ ہو'' اب اگر یہ معاملہ دارالقضاء جاتا ہے تب بھی قاضی وقوع طلاق کا فیصلہ نہیں کرے گا، درمختار میں ہے :

قال : أنت طالق أو أنت حر وعنى الإخبار كذبا وقع قضاء ، إلا إذا أشهد على ذلک ۔ (۴)

اس سے صاف واضح ہے کہ حدیث مذکور کا اطلاق عمومی نہیں ہے؛ بلکہ یہ اُمور قضاء کے ساتھ مخصوص ہے، اگر حکم عمومی ہوتا جھوٹی تو طلاق سے پہلے گواہ بنانے یا نہ بنانے سے کچھ فرق نہ پڑتا اور بہ تقاضۂ عموم بہر حال اس پر طلاق واقع ہوجاتی۔

---

(۱) ردالمحتار: ۳/ ۲۳۶۔

(۲) ابوداود: ۲۱۹۴۔

(۳) ابوداود: ۲۱۹۴۔

(۴) الدرالمختار وحاشیہ ابن عابدین: ۳/ ۲۹۳۔

بہر حال، ان سب کے باوجود دارالافتاؤں کا چلن یہی ہے کہ ان سب مسائل میں وہ حکم قضاء کے مطابق فتویٰ لکھتے ہیں اور ان مقامات میں جہاں طلاق واقع نہیں ہونی چاہئے، وہاں بھی بے پروا ہو کر طلاق واقع کر دیتے ہیں، اس کی اصل وجہ علامہ کشمیریؒ کے بقول دیانت وقضاء میں فرق سے غفلت ہے اور متداول کتبِ فقہ میں جہاں بیشتر مسئلے قضاء کے لکھے ہوئے ہیں ان کے مطابق فتوے لکھنا ہے، میرے تخمینہ کے مطابق دارالافتاؤں میں ستر اسیّ فیصد سوالات طلاق یا میراث کے آتے ہیں جن میں چالیس سے پچاس فیصد سوالات طلاق کے ہوتے ہیں، یعنی معاشرہ طلاق کی آگ میں بری طرح جھلس رہا ہے، طلاق کی وجہ سے صرف میاں بیوی جدا نہیں ہوتے؛ بلکہ دو خاندان ٹوٹ جاتے ہیں، بچوں پر جو سنگین اثرات پڑتے ہیں وہ بہت خطرناک ہیں، اگر ان مسائل پر توجہ دی گئی تو یقیناً طلاق کی شرح معاشرہ سے کم ہو جائے گی اور اس لعنت کی وجہ سے بر پا ہونے والے فساد جس سے قوم تباہ ہو رہی ہے اور ان کا مستقبل خاکستر ہو رہا ہے ان سے کسی حد تک بچ پانا ممکن ہوگا، اللہ کرے کہ ارباب فتاویٰ، سنجیدہ علمی شخصیات اور دردمند اہل علم اس سنگین مسئلہ میں غور کریں اور اُمت کو جو مسئلہ درپیش ہے اس سے انھیں نجات دلانے میں مدد کریں، اگر ضرورت پڑنے پر حضرت تھانویؒ دوسرے فقہ سے رجوع کر سکتے ہیں تو یقیناً آپ اپنی ہی فقہی کتابوں میں موجود مسئلہ میں محض دیانت وقضاء میں فرق کر کے اور اپنا دائرۂ کار متعین کر کے اُمت کے ایک بڑے طبقہ کو (جو پہلے سے ہی غریب، مفلوک الحال اور ان پڑھ ہوتے ہیں) کا گھر ٹوٹنے اور مزید شکستہ حال ہونے سے بچا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے۔

ایک درخواست

یہ میرے ناقص فکر ومطالعہ اور علمی وعوامی تجربہ کا حاصل ہے، کوئی انسان لغزش وخطا سے خالی نہیں، اس لئے اگر اہل علم ونظر قارئین کو اس تحریر میں کوئی قابل اشکال پہلو یا لائق اصلاح بات نظر آئے تو نشان دہی فرما دیں، ساتھ ہی اگر اس موضوع یا اس کے ذیلی ابحاث سے متعلق اضافی مواد آپ کے مطالعہ میں ہو تو آگاہ فرمائیں، بے حد شکر گزار ہوں گا۔

• • •

جینیٹک سائنس سے پیدا ہونے والے چند مسائل

خالد سیف اللہ رحمانی

اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا ایک مظہر یہ ہے کہ اس نے انسانوں کے اندر جہاں بہت سی چیزوں میں اشتراک رکھا ہے، وہیں بہت سی چیزوں میں اسے انفرادیت سے بھی نوازا ہے، مشترک اوصاف موانست پیدا کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی راہ فراہم کرتے ہیں اور انفرادی صلاحیتوں سے اس کی پہچان اور شناخت قائم ہوتی ہے اور یہ دونوں ہی چیزیں انسان کے لئے ضروری ہیں۔

انسانی شناخت میں کچھ پہلو تو وہ ہیں، جن کا تعلق ظاہری کیفیات سے ہے، جیسے صورت، شباہت، رنگ وروپ، چال ڈھال، بولنے کی، ہنسنے کی اور رونے کی آوازیں، مزاج ومذاق وغیرہ، یہ خدا کی خلاقیت کا کمال ہے کہ ایک ہی ماں باپ کے ذریعہ وجود میں آنے والے لڑکوں اور لڑکیوں میں اتنا غیر معمولی فرق پایا جاتا ہے، یہ بجائے خود اللہ کی ربوبیت پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے، انسان جب مشین کے ایک سانچے سے کوئی چیز ڈھالتا ہے تو اس سے ڈھل کر بننے والی تمام چیزیں ایک ہی طرح کی صلاحیت کی حامل ہوتی ہیں؛ لیکن قدرت کا دست فیاض ایک ہی وسیلہ سے متنوع چیزوں کو وجود میں لاتا ہے۔

انسان کی ذات میں کچھ انفرادی وامتیازی پہلو اندرونی طور پر بھی ہوتا ہے، جسم جن بے شمار خلیات سے مرکب ہے، وہ بھی اپنی شناخت اور پہچان رکھتے ہیں اور خصوصیات وامتیازات کے حامل ہیں، اس حقیقت کا انکشاف جینیٹک سائنس کے وجود سے ہوا ہے، جو اس وقت سائنسدانوں کی توجہ کا خاص مرکز ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ بہت سی ناقابل علاج خیال کی جانے والی بیماریوں کا علاج بھی دریافت ہوسکتا ہے۔

ڈی این اے ٹیسٹ

اس سائنس کے ذیل میں پیدا ہونے والا ایک مسئلہ ڈی این اے ٹیسٹ کا ہے، ڈی این اے انسان کے خون، گوشت، ہڈی، ناخن اور بال وغیرہ انسانی اجزاء سے حاصل ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ بچہ کا نسب ماں باپ سے ثابت ہونے اور قاتل وزانی کی شناخت کے سلسلے میں اس ٹیسٹ کی شرعاً کیا حیثیت ہوگی اور کس حد تک اس کا اعتبار کیا جائے گا؟

تحقیق نسب اور ٹیسٹ

جہاں تک بچوں کے نسب کی بات ہے تو اس سلسلہ میں شریعت میں تفصیل بیان کی گئی ہے؛ کیوں کہ اسلام میں نسب کی بڑی اہمیت ہے اور قرآن مجید نے اس کو بطور احسان کے ذکر کیا ہے۔(۱)

شریعت نے نسب کے سلسلہ میں جو اُصول بتایا ہے، وہ یہ ہے کہ نکاح صحیح، نکاح فاسد، نیز شبہ کی بنا پر غلط فہمی میں عورت سے قربت کی بنا پر جو حمل ٹھہرے، اس کا نسب اس مرد سے متعلق ہوگا، جس نے اس سے وطی کیا، یا وہ جس کے نکاح میں تھی اور اگر نسب کے سلسلہ میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کا ثبوت دو ذرائع سے ہوگا، ایک: اقرار، دوسرے: گواہی۔(۲)

یہ ذرائع فقہاء کے نزدیک متفق علیہ ہیں، گو اور ذرائع بھی ہیں جن کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، یعنی قیافہ اور قرعہ اندازی، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک قیافہ سے بھی نسب ثابت ہو جاتا ہے؛ بشرطیکہ اقرار و شہادت موجود نہ ہو؛(۳) لیکن حنفیہ کے نزدیک محض قیافہ سے نسب ثابت نہیں ہوتا۔(۴)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عورت اگر کسی مرد کے نکاح یا عدت میں ہو، یا نکاح فاسد کے بعد مرد و عورت کے درمیان تعلق قائم ہو چکا ہو اور زیادہ سے زیادہ مدت حمل کے اندر بچہ پیدا ہوا ہو تو بچہ کا نسب اسی مرد سے ثابت ہوگا؛ لیکن اگر ایسی صورت ہو کہ بچہ کا نسب معلوم نہ ہو، جیسے: لقیط، جس کے بارے میں ایک سے زیادہ مرد یا عورتیں دعویدار ہوں، یا میٹرنٹی اسپتال میں نومولود بچے خلط ملط ہو جائیں اور ماں کی شناخت باقی نہ رہے، تو ان صورتوں میں ڈی این اے ٹیسٹ سے استفادہ کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے، جمہور فقہاء کے نزدیک قیافہ کے ذریعہ نسب ثابت ہو سکتا ہے، تو ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعہ تو بدرجہ اولیٰ نسب ثابت ہوگا؛ کیوں کہ ڈی این اے ٹیسٹ سائنسی تحقیق اور مشاہدہ پر مبنی ہے اور قیافہ محض ظن پر۔

لیکن غور کیا جائے تو حنفیہ کے نزدیک بھی مجہول النسب بچوں کے ماں باپ کی نسبت متعین کرنے کے لئے

---

(۱) الفرقان: ۵۴، النحل: ۷۲۔

(۲) دیکھئے: بدائع الصنائع: ۶/۲۶۶، کتاب الدعوی، بیان مایثبت بہ النسب۔

(۳) بدایۃ المجتہد: ۲/۲۲۸، کتاب الفرائض، ھل یلحق أولاد الزنا بآبائھم، مغنی المحتاج: ۴/۴۸۹، کتاب الدعویٰ، فصل فی شروط القائف، المغنی لابن قدامہ: ۷/۴۸۲، کتاب اللقیط، فصل القافۃ۔

(۴) المبسوط: ۱۷/۱۰، کتاب الدعویٰ، دعویٰ النسب۔

ڈی این اے ٹیسٹ کافی ہونا چاہئے؛ اس لئے کہ حنفیہ کے نزدیک بھی اثبات دعوی کے وسائل میں سے ایک قرائن قاطعہ ہے، اور اس کا ثبوت کتاب وسنت اور آثار وصحابہ سے ہے۔

● حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جو خون آلود قمیص لاکر دی تھی، اسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسی قرینہ سے پہچانا کہ قمیص خون آلود تو تھی؛ لیکن پھٹی ہوئی نہیں تھی، اور بھیڑیا کا اس طرح کسی کو پھاڑ کھانا کہ اس کے کپڑے نہ پھٹے ہوں، نا قابل تصور ہے۔(۱)

● حضرت یوسف علیہ السلام پر امرأۃ عزیز کی تہمت کے سلسلہ میں شیر خوار بچے کا فیصلہ اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ اگر ان کا دامن آگے سے چاک ہو تو عزیز مصر کی بیوی سچی ہے، اور اگر پیچھے سے پھٹا ہو تو حضرت یوسف علیہ السلام کا دعویٰ برأت صحیح ہے۔(۲)

● قرآن مجید نے ایک بچہ کے سلسلہ میں مقدمہ پیش کرنے والی دو عورتوں سے متعلق حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کا ذکر کیا ہے۔(۳)

● رسول اللہ ﷺ نے نکاح کی اجازت کے معاملہ میں کنواری لڑکی کی خاموشی کو اس کی اجازت قرار دیا، ظاہر ہے کہ یہ قرینہ ہی کی بنیاد پر فیصلہ ہے۔

● حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے شراب کی قئے اور اس کی بو کی بنیاد پر شراب کی حد لگانے کا فیصلہ فرمایا اور اسی پر امام مالکؒ کا عمل بھی ہے۔

● اسی طرح بے شوہر عورت حاملہ ہوئی تو حضرت عمرؓ نے اس پر زنا کی سزا جاری فرمائی؛ چنانچہ مالکیہ وحنابلہ اس کو حد جاری کرنے کے لئے کافی قرار دیتے ہیں۔(۴)

ظاہر ہے کہ یہ تمام فیصلے قرائن ہی کی بنیاد پر ہیں، علامہ ابن فرحون مالکیؒ نے تبصرۃ الحکام میں اور علامہ ابن قیمؒ نے الطرق الحکمیہ میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، اس بارے میں تو اختلاف ہوسکتا ہے کہ کن احکام میں قرائن قاطعہ کا اعتبار ہوگا اور کن میں نہیں، کن قرائن کو قاطعہ سمجھا جائے گا اور کن کو ضعیف؟ لیکن فی نفسہٖ قرائن کے معتبر ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، پس جب اقرار اور بینہ موجود نہ ہو تو ایسا بچہ جس کی نسبت مجہول یا مشتبہ ہو، اس کے سلسلہ میں ڈی این اے ٹیسٹ کا اعتبار ہونا چاہئے۔

(۱) دیکھئے: الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۹/۱۴۳۔
(۲) سورۂ یوسف: ۲۶-۲۷۔
(۳) سورۂ الانبیاء: ۷۹۔
(۴) دیکھئے: تبصرۃ الحکام لابن فرحون: ۳/۹۷، الباب السبعون فی القضاء بما ظہر من قرائن الأحوال والأمارات۔

اسی طرح اگر شوہر پیدا ہونے والے بچہ کے نسب کی نفی کرے تو اس صورت میں لعان کرایا جاتا ہے، جو عورت کے حق میں حد زنا اور شوہر کے حق میں حد قذف کے قائم مقام ہو، پس اگر مرد نسب کی نفی کرتا ہو، عورت اس کی تکذیب کرتی ہو اور چاہتی ہو کہ نومولود کا ڈی این اے ٹیسٹ کرایا جائے تو ایسی صورت میں عورت کے مطالبہ کو قبول کیا جانا چاہئے اور لعان نہیں ہونا چاہئے؛ تاکہ ایک مسلمان پاکدامن عورت سے تہمت دور کی جاسکے، اور اس لئے بھی کہ حدود شبہات کی بنا پر ساقط ہو جاتی ہیں، جب کہ لعان حدود کے قائم مقام ہے اور ڈی این اے ٹیسٹ کم سے کم شبہ پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔

قاتل وزانی کی شناخت

البتہ قاتل کی شناخت اور اس پر قصاص کا اجراء، اسی طرح انفرادی یا اجتماعی آبروریزی کے مقدمات میں زانی کی شناخت کے لئے محض ڈی این اے ٹیسٹ کو بنیاد بنانا درست نہیں ہوگا؛ کیوں کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے:
''إدرءوا الحدود بالشبهات''۔(۱)

اسی لئے فقہاء کے یہاں یہ ایک متفق علیہ اور مسلمہ قاعدہ ہے کہ شبہات کی بنا پر حدود ساقط ہو جاتی ہیں: ''الحدود تندرئ بالشبهات'' (۲) اور خاص کر زنا کے معاملہ میں چار گواہوں کی شہادت کو ضروری قرار دیا گیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ بغیر مطلوبہ شہادت کے حد زنا جاری نہیں کی جاسکتی، اسی طرح عویمر عجلانیؓ والا واقعہ مشہور ہے، جس میں آپ ﷺ نے متہم شخص کی شہادت کو ملحوظ رکھتے ہوئے فرمایا کہ اگر مولود فلاں شکل کا ہو تو مرد اپنے دعویٰ میں سچا ہوگا، اتفاقاً وہ اسی صورت پر پیدا ہوا، اس موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں بغیر بینہ کے رجم کرتا تو اس عورت کو رجم کرتا؛ لیکن آپ ﷺ نے سزا جاری نہیں فرمائی۔(۳)

اسی لئے محض ڈی این اے ٹیسٹ کی بنیاد پر زنا کی سزا یا قصاص نافذ نہیں کیا جاسکتا؛ البتہ ڈی این اے ٹیسٹ کی بنیاد پر اگر کسی کا کردار مشکوک قرار پاتا ہو تو قاضی اپنی صواب دید سے تعزیر کرسکتا ہے اور حکومت سزا کا قانون بنا سکتی ہے؛ کیوں کہ تعزیر کے لئے شک وشبہ سے عاری بینہ کا ہونا ضروری نہیں۔

ڈی این اے ٹیسٹ سے چوں کہ جرم کی تحقیق اور مجرم کے تعاقب میں مدد مل سکتی ہے، بعض اوقات نفسیاتی اثر ڈال کر حقیقی مجرم سے اقرار کرایا جاسکتا ہے اور قاضی کی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی واقعہ کی تہہ تک پہنچنے کی حتی المقدور کوشش کرے؛ اس لئے وہ ضرورت محسوس کرے تو کوڈی این اے ٹیسٹ پر مجبور کرسکتا ہے۔

---

(۱) تلخیص الحبیر: ۵۶/۴، کتاب حد الزنا، حدیث نمبر: ۲۰۳۶۔ (۲) المبسوط للسرخسی، کتاب الایمان: ۱۴۵/۸۔
(۳) بخاری مع الفتح: ۴۵۲/۹، اتباع النبی ﷺ لو کنت راجما بغیر بینۃ۔

جینیٹک ٹیسٹ نکاح سے پہلے

جینیٹک ٹیسٹ کے ذریعہ نہ صرف موجودہ امراض کا پتہ چلایا جاسکتا ہے؛ بلکہ امکان کے درجہ میں آئندہ پیدا ہونے والے بعض امراض کی نشاندہی بھی ہوسکتی ہے، اس پس منظر میں جینیٹک ٹیسٹ کو فی زمانہ خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے، اس سے متعلق کئی شرعی مسائل پیدا ہوئے ہیں اور سوالات اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں :

پہلی بات تو یہ ہے کہ نکاح سے پہلے مرد وعورت کا جینیٹک ٹیسٹ کرانا درست ہے یا نہیں؟ تاکہ معلوم ہوجائے کہ دوسرا فریق کچھ ایسی بیماری میں تو مبتلا نہیں ہے جو موروثی طور پر منتقل ہوتی ہے، یا وہ قوت تولید سے محروم تو نہیں ہے؟ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ نکاح ایک اخلاقی اور سماجی ضرورت ہے اور انسان کے جسم میں کتنی ہی بیماریاں پلتی رہتی ہیں اور جب تک غیر معمولی صورت پیدا نہ ہوجائے اور وہ اُبھر نہ جائیں، کاروبارِ زندگی چلتا ہے، اگر جینیٹک ٹیسٹ کے ذریعہ چھپی ہوئی بیماریوں کو کریدا جائے تو بے شمار مرد وعورت مریض ثابت ہوں گے اور ان کا نکاح کی ڈوری سے بندھنا دشوار ہوجائے گا، جو اخلاقی اور انسانی اعتبار سے انسان کے لئے بہت ہی نقصان دہ ہے؛ اسی لئے شریعت نے بہ تکلف کھود کُرید کرنے کو ناپسند کیا ہے۔

اس لئے اس حقیر کا خیال ہے کہ نکاح سے پہلے جینیٹک ٹیسٹ کے مطالبہ کو نادرست ہونا چاہئے اور اس کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہئے۔

بعض باتوں سے اس کے جائز ہونے کا خیال پیدا ہوسکتا ہے، مخطوبہ کو دیکھنے کی اجازت یا ایسی عورت سے نکاح کی ترغیب جس میں ماں بننے کی صلاحیت زیادہ ہو :

تزوجوا الودود الولود فإني مكاثر بكم الأمم ۔ (۱)

لیکن جینیٹک ٹیسٹ جن عیوب اور اندرونی خامیوں کا احاطہ کرتا ہے، اس کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہے، مخطوبہ کا چہرہ دیکھ کر اس کی شکل وصورت کے بارے میں اندازہ کیا جاسکتا ہے، جس کا مقصد طرفین کی ایک فطری خواہش کی تکمیل ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ اس کا رفیق شکل وصورت کے اعتبار سے قابل قبول ہو؛ لیکن کسی کم خوبصورت شخص سے انسان کی طبیعت اس طرح اِبا نہیں کرتی جس طرح کسی بیمار سے طبیعت کو فرار ہوتا ہے، اسی طرح عورت میں زیادہ بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت کا اندازہ، کنواری ہو تو خاندان کی دوسری عورتوں کو دیکھ کر اور بیوہ یا مطلقہ ہو تو اس کی ماضی کی زندگی کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے؛ لیکن کم بچہ ہونا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا بخلاف جینیٹک ٹیسٹ کے کہ اس کی کھوج کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب النہی عن تزویج من لم یلد من النساء، حدیث نمبر: ۲۰۵۰۔

اگر ٹیسٹ کرایا جائے اور بعد کو کوئی بیماری نکلی تو اس پر طرفین کو صبر ہوجاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے معاون بن جاتے ہیں، اور اگر اس کا اظہار نکاح سے پہلے ہوجائے تو ایک دوسرے سے فرار پیدا ہوگا اور اس طرح خطرہ ہے کہ سماج میں بہت سے مرد وعورت نکاح سے محروم رہ جائیں اور اس کا نقصان ظاہر ہے۔

ٹیسٹ کی رپورٹ کی بنا پر اسقاطِ حمل

جینیٹک ٹیسٹ کے ذریعہ استقرارِ حمل کے بعد تین ماہ پورا ہونے سے پہلے ہی جانا جاسکتا ہے کہ رحم مادر میں پرورش پانے والا بچہ ناقص العقل یا ناقص الاعضاء ہے، سوال یہ ہے کہ کیا اس مقصد کے لئے معالج کے مشورہ سے جینیٹک ٹیسٹ کرانا اور اگر مولود کے ناقص العقل یا ناقص الاعضاء ہونے کا اندیشہ ہو تو اسقاطِ حمل جائز ہوگا یا نہیں؟

اس ٹیسٹ کا مقصد چوں کہ مرض کو دریافت کرنا اور مولود اور اس کے والدین کو تکلیف ومضرت سے بچانا ہے؛ اس لئے اس ٹیسٹ کے جائز نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اور فقہاء نے روح پیدا ہونے سے پہلے عذر کی بنا پر اسقاطِ حمل کی اجازت دی ہے :

یکرہ أن تسقی لإسقاط حملها وجاز لعذر حیث یتصور ۔ (۱)

یہ بات مکروہ ہے کہ عورت اپنا حمل ساقط کرنے کے لئے کوئی چیز پیئے؛ البتہ عذر کی وجہ سے جائز ہے جب تک کہ شکل وصورت نہ بنی ہو۔

اس لئے معالج کے مشورہ سے اس مرض کے لئے ٹیسٹ کرانا اور ٹیسٹ رپورٹ کی روشنی میں ضرورت محسوس ہو تو چار ماہ کے اندر حمل ساقط کرنا جائز ہوگا۔

ٹیسٹ رپورٹ کی بنیاد پر تولید سے روکنا

جینیٹک ٹیسٹ کے ذریعہ یہ بات معلوم کی جاسکتی ہے کہ کسی شخص کی آئندہ نسل میں پیدائشی نقائص کے کیا امکانات ہیں، سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں اسے تولید سے روکا جاسکتا ہے؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے، اس حقیر کا خیال ہے کہ اگر معمولی درجہ کا امکان ہو اور زیادہ اُمید ایسا نہ ہونے کی ہو تو تولید سے روکنا درست نہیں؛ کیوں کہ احکام شریعت کی بنیاد ظنِ غالب پر ہوتی ہے اور کسی حکم سے استثناء عذرِ شدید کی بنا پر ہی دیا جاتا ہے، ہاں اگر شدید قسم کے نقائص کے پائے جانے کا ظنِ غالب ہو تو معتبر ماہر معالج کے مشورہ سے نیز زوجین کی اجازت سے تولید کو منع کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) الدر مع الرد: ۲۰۵/۵، کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی البیع۔

جنین کے موروثی مرض میں مبتلاء ہونے کی تحقیق کیلئے ٹیسٹ

چار ماہ گذر جانے کے بعد محض تحقیق کے لئے کہ جنین کسی موروثی مرض میں مبتلا تو نہیں ہے؟ ٹیسٹ کرانا کراہت سے خالی نہیں؛ کیوں کہ اگر اس سے مرض ظاہر ہوجائے تو حمل ساقط کرانے کے ارادہ کو تقویت حاصل ہوگی اور چار ماہ بعد اسقاط حمل جائز نہیں؛ البتہ اگر اس تحقیق کی وجہ سے بحالت حمل جنین کا علاج ہوسکتا ہو یا ولادت کے فوراً بعد علاج کرانا مقصود ہو تو معالج کے مشورے سے ٹیسٹ کرایا جاسکتا ہے۔

ٹیسٹ سے جنون کی تحقیق اور فسخ نکاح

جینیٹک ٹیسٹ سے ایک مسئلہ فسخ نکاح کا بھی متعلق ہے؛ کیوں کہ اس ٹیسٹ کے ذریعہ کسی شخص کے دماغی طور پر غیر متوازن ہونے کو جانا جاسکتا ہے؛ اس لئے اگر عورت شوہر کے مجنون ہونے کا اور اس کی وجہ سے فسخ نکاح کا دعویٰ کرتی ہو اور جینیٹک ٹیسٹ کی بنیاد پر معتبر و دیانت دار معالج اس کے دماغی طور پر بہت زیادہ غیر متوازن ہونے اور مجنون ہونے پر مطمئن ہو تو اس کا نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ جنون ان اسباب میں سے ہے، جن کی بنیاد پر زوجین کے درمیان تفریق کی جاسکتی ہے اور جنون کے ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ فقہاء نے علامات پر رکھا ہے اور جینیٹک ٹیسٹ کی رپورٹ بھی من جملہ علامات کے ہے۔

اسٹیم خلیے

جینیٹک سائنس کے نتیجہ میں جو مسائل اُبھر کر سامنے آئے ہیں، ان میں اسٹیم خلیوں سے متعلق بعض فقہی سوالات بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

جینی اسٹیم سیل (Embryonic Stem Cell) دراصل علقہ ہے، استقرار حمل کے چار پانچ دن بعد نطفہ نشوونما کے ابتدائی مراحل میں ''علقہ'' کی صورت اختیار کرتا ہے، جسے بلاسٹوسسٹ (Blastocyst) کہتے ہیں، اسی بلاسٹوسسٹ کے خلیات اسٹیم سیل کہلاتے ہیں، اس کے بارے میں سائنسدانوں کا خیال ہے کہ وہ مکمل انسان بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنے محدود دائرہ میں آکسیجن بھی حاصل کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا جینی اسٹیم سیل کی حیثیت ذی روح انسانی وجود کی ہے؟ اور وہ وجود انسانی کی طرح قابل احترام ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اسے حقیقی انسان کا درجہ نہیں دیا جاسکتا؛ کیوں کہ ابھی یہ علقہ اور مضغہ کے دائرے میں ہے اور اس میں جو زندگی پائی جاتی ہے، وہ نباتی زندگی کے مشابہ ہے، جس میں نشوونما تو ہوتی ہے؛ لیکن تنفس کا نظام نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ۱۶ ہفتوں سے پہلے فقہاء نے اسقاط حمل کی اجازت دی ہے، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں :

قال يباح لها أن تعالج في استزال الدم مادام الحمل مضغة أو علقة ولم يخلق له عضو و قدروا تلک المدة بمأة وعشرين يوما ، و إنما ذالک ؛ لأنه ليس بآدمي ۔ (۱)

عورت کے لئے جائز ہے کہ جب تک حمل مضغہ یا علقہ نہ بن جائے اوراس کی عضو کی تخلیق نہ ہوجائے ،خون جاری کرلے ، (یعنی ساقط کرلے) اور فقہاء نے اس کی مدت ۱۲۰ ردن متعین کیا ہے، یہ اس لئے جائز ہے کہ وہ ابھی انسان نہیں بنا ہے۔

فقہاء کہتے ہیں کہ جب تک حمل مضغہ یا علقہ کی صورت میں ہواوراس میں عضو نہ بنا ہوتو عورت کے لئے خون جاری کرانے یعنی حمل ساقط کرلینے کے لئے تدبیر اختیار کرنا مباح ہے،جس کی مدت فقہاء نے ۱۲۰ ردن متعین کی ہے؛ کیوں کہ وہ آدمی نہیں ہے۔

جنین سے اسٹیم سیل کا حصول

سائنسی تحقیق کے مطابق درج ذیل ذرائع سے اسٹیم سیل حاصل کیا جاسکتا ہے :

(۱) ایک یا دو ہفتہ پرانے جنین (Emberyo) سے۔

(۲) اسقاط شدہ جنین سے۔

(۳) نومولود بچہ کی ناف کے خون سے۔

(۴) ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے باقی ماندہ علقات سے۔

(۵) ہڈیوں کے گودے (Bone Merrow) سے۔

(۶) بالوں کی جڑوں (Hair Mollicle) سے۔

(۷) چمڑے کے نیچے کی چربی دار خلیوں (Fat Cells) وغیرہ سے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا رحم مادر میں پرورش پانے والے جنین یا اسقاط کردہ جنین سے اسٹیم سیل لے کر کوئی عضو بنایا جاسکتا ہے؛ تاکہ اسے علاج کے لئے استعمال کیا جاسکے؟ اس سلسلہ میں دو پہلو قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ جنین سے سیل کا حصول کہیں اس کے لئے مہلک تو نہیں ہوگا ، دوسرے ان سیلس سے عضو کی تیاری کا مطلب یہ ہے کہ وہ آئندہ پیش آنے والی ضرورت کی تکمیل کے لئے ہے اور جہاں تک اجزاء انسانی سے بوقت ضرورت بطریقہ علاج

(۱) ردالمحتار: ۱؍۲۷۲، کتاب الطہارۃ، باب الحیض۔

فائدہ اُٹھانے کی بات ہے تو بعض اہل علم کی رائے اس کے مطلقاً ممنوع ہونے کی ہے اور جن حضرات نے اس کی اجازت دی ہے، ان کے یہاں بھی یہ جواز کچھ شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، جن میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ ضرورت بالفعل موجود ہو؛ لہٰذا اعضو سازی کے لئے جنین سے سیل لینا درست نظر نہیں آتا۔

نومولود کی نال سے اسٹیم سیل کا حصول

اسی طرح بچہ کی نال سے اسٹیم سیل حاصل کرنا اور اس سے عضو بنانا؛ تا کہ مستقبل میں اگر اس بچہ کو عضو کی پیوندکاری کی ضرورت پڑے تو اسے کام میں لایا جائے، درست نہیں ہوگا؛ کیوں کہ محض ایک امکانی اور موہوم خطرہ کے لئے اس قسم کا تکلف — جو اجزاء انسان کے استعمال پر مبنی ہے — شریعت کے مزاج کے خلاف ہے، ہاں اگر ٹیسٹ کے ذریعہ معالج پر یہ بات منکشف ہوئی کہ کچھ عرصہ بعد اس نومولود کے فلاں عضو کے بے کار ہوجانے کا قوی اندیشہ ہے اور اس موقع پر پیوندکاری کی ضرورت پیش آسکتی ہے تو نال سے اسٹیم سیلس حاصل کرنا اور اسے محفوظ کرکے آئندہ کام میں لانا درست ہوگا؛ کیوں کہ سیلس لینے کی وجہ سے اس کے لئے فی الحال کوئی بڑا خطرہ نہیں ہے اور اس کے اجزائے جسم خود اسی کے لئے استعمال ہوں تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

انسانی سیل سے حیوان میں عضو کا نمو

یہ بات ممکن ہے کہ انسان کا اسٹیم سیل کسی حیوان میں ڈال کر اس کے جسم میں مطلوبہ عضو تیار کرلیا جائے؛ کیوں کہ اس صورت میں ایک انسان کا اسٹیم سیل خود اسی کے جسم میں استعمال ہو رہا ہے اور جسم میں اجنبی شئے کو رد کرنے کی جو کیفیت ہے جس کی وجہ سے بہت سی دفعہ پیوندکاری کامیاب نہیں ہو پاتی، اس سے بھی حفاظت ہوجاتی ہے اور حیوان کو پیدا ہی کیا گیا ہے انسان کے فائدہ کے لئے؛ اس لئے انسانی علاج کے مقصد سے ان کے استعمال میں بھی قباحت نہیں۔

اگر حلال جانور کے جسم میں عضو کا تیار کرنا ممکن ہو تو ضروری ہوگا کہ حلال جانوروں سے استفادہ کیا جائے؛ کیوں کہ حالت اختیار میں حرام جانور کا گوشت استعمال کرنا درست نہیں؛ البتہ کوئی عضو کسی حرام جانور میں ہی تیار کیا جاسکتا ہو تو ایسی صورت میں اس کی بھی اجازت ہے؛ کیوں کہ علاج کے لئے اگر حلال شئے کافی نہ ہو تو حرام کے استعمال کی اجازت ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عرفجہؓ کو سونے کی ناک لگوانے،(۱) اور اصحاب عرینہ کو اونٹ کا پیشاب پینے کی اجازت دی تھی۔(۲)

---

(۱) سنن الترمذی، أبواب اللباس، باب ماجاء فی شد الاسنان بالذہب، حدیث نمبر: ۱۷۷۰۔

(۲) سنن الترمذی، أبواب الطہارۃ، باب ماجاء فی بول مایؤکل لحمہ، حدیث نمبر: ۷۲۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کیلئے نطفہ سے اسٹیم سیل کا حصول

ایک اہم سوال یہ ہے کہ جنینی اسٹیم سیل یوں تو بالغوں سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اس کی نشوونما میں دشواریاں ہیں، اسی پس منظر میں ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ حمل کے استقرار اور اس کی ابتدائی نشوونما کے جدید طریقہ کو اختیار کرنے کی صورت میں اگر میاں بیوی کی اجازت سے سلیس حاصل کرلیا جائے اور ان کو استعمال کیا جائے تو کیا ایسا کرنا درست ہوگا؟

اس سلسلہ میں شریعت کے مزاج و مذاق اور کتاب وسنت کی عمومی تعلیمات کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر زوجین عام فطری معمول کو اختیار کرکے بچے پیدا نہیں کرسکتے ہیں، تو ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ حمل کے استقرار اور نشوونما کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؛ کیوں کہ یہ بھی اس کے حق میں علاج ہے؛ البتہ ضروری ہے کہ یہ سیل میاں بیوی ہی کے نطفہ سے حاصل کیا گیا ہو، اجنبی کے نطفہ سے حاصل کیا گیا ہو تو یہ قطعاً جائز نہیں؛ کیوں کہ نسب کی حفاظت شریعت کے مقاصد میں ہے اور اسی لئے زنا کو حرام کیا گیا ہے۔

• • •

دماغی موت اور قتل بہ جذبۂ رحم — شرعی حیثیت اور احکامات

مولانا شاہد علی قاسمی ☆

موت کی حقیقت اور علامت

بدن سے روح نکلنے کا نام موت ہے؛ لیکن رُوح کی کیا حقیقت ہے؟ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا :

> وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ (الاسراء:۸۵)
>
> وہ آپ سے رُوح کے بارے میں پوچھتے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ رُوح میرے رب کا حکم ہے اور تمھیں علم نہیں دیا گیا ہے، مگر تھوڑا۔

اس آیت میں دو باتیں واضح طور سے آگئی ہیں کہ روح امر رب ہے؛ لیکن اس کی کیا حقیقت ہے؟ تو اس کا کامل علم انسان کو حاصل نہیں ہوسکتا، جب رُوح کی پوری حقیقت سے انسان واقف نہیں، تو موت کا قطعی فیصلہ بھی مشکل امر ہے؛ اس لئے فقہاء نے موت کے فیصلہ کے لئے کچھ علامات بیان کی ہیں، جن کے ظہور اور عدم ظہور سے فقہاء موت واقع ہونے اور نہ ہونے کا حکم لگاتے ہیں؛ چنانچہ فقہاء قریب المرگ جانور — جب کہ اسے ذبح کیا جائے، تو وہ حلال ہوگا یا نہیں — کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ اگر ذبح کئے جانے کے بعد جانور منھ بند کرلے، یا آنکھ بند کرلے یا پیر سکیڑ لے، یا بال کھڑا ہوجائے، یا خون نکل آئے، یا حرکت کرے، تو ذبیحہ حلال ہوگا، ورنہ حرام؛ چنانچہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں :

> ذبح شاة لم تدر حياتها وقت الذبح ولم تتحرك ولم يخرج الدم ، إن فتحت فاها لا تؤكل ، وإن ضمته أكلت ، وإن مدت رجلها لا تؤكل وإن قبضتها أكلت وإن نام شعرها لا تؤكل وإن

☆ استاذ: المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

قام أكلت ، لأن الحيوان يسترخي بالموت ففتح فم وعين ومد رجل ونوم شعر علامة الموت ۔ (۱)

ایسی بکری ذبح کی جس کے موت وحیات کا علم نہیں ہو سکا اور نہ ذبح کرتے وقت اس میں حرکت ہوئی اور نہ خون نکلا تو اگر اس کا منھ کھلا ہے تو وہ نہیں کھائی جائے گی اور منھ بند ہے تو کھائی جائے گی اور اگر اس کے پاؤں پھیلے ہوتے ہیں تو نہیں کھائی جائے گی اور پاؤں سکڑ لیا تو کھائی جائے گی، اگر اس کے بدن کے کھڑے نہیں ہیں تو نہیں کھائی جائے اور اگر اس کے بند کے بال کھڑے ہو گئے تو کھائی جائے گی؛ کیوں کہ موت کے بعد جانوروں کا بدن ڈھیلا پڑ جاتا ہے تو آنکھ اور منھ کا کھلا ہونا، پاؤں کا پھیلا ہونا اور بدن کے بالوں کا کھڑا نہ ہونا یہ سب موت کی علامتیں ہیں۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دین آسان ہے، انسانی زندگی سے متعلق کسی بھی حکم میں شریعت نے پیچیدگی نہیں رکھی، جیسے ظہر کی نماز کب پڑھنی ہے اور مغرب کس وقت؟ تو اس کے لئے واضح علامت بتادی گئی کہ جب سورج ڈھل جائے تو ظہر پڑھ لو، اور جب سورج غروب ہوجائے تو مغرب پڑھ لو، اسی طرح موت کے بارے میں سمجھنا چاہئے کہ عام حالات میں عرفاً جس کیفیت کو موت کہا جاتا ہے اسے موت سمجھیں گے، جیسے قلب کی حرکت کا بند ہونا، دوران خون کا بند ہونا اور بدن کا ٹھنڈا ہوجانا وغیرہ؛ کیوں کہ ہر شخص کے یہ بس میں نہیں کہ وہ ہر مرنے والے شخص کے بارے میں مخصوص آلات سے تحقیق کروائے کہ اس کی موت واقع ہوئی یا نہیں؛ کیوں کہ اس طرح کی تحقیق مخصوص ہاسپٹل میں مخصوص آلات کے ذریعہ ہوتی ہے اور جو کافی خرچیلا بھی ہے؛ اس لئے عام حالات میں موت کا فیصلہ ظاہری علامات کے ذریعہ ہی کیا جائے گا۔

تاہم اس میں بھی شبہ نہیں کہ اسلام سائنسی تحقیق کو رد نہیں کرتا ہے؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی اور اس سے بڑھ کر اس کی طرف دعوت بھی دیتا ہے، نصف صدی پہلے ہی سے فن طب کے ماہرین نئی سائنسی تکنیک کے ذریعہ موت کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور تقریباً ماہرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اصل موت دماغی موت ہے کہ دماغی موت کے بعد باقی دوسرے اعضاء کی حیات غیر مستقر ہوجاتی ہے، یعنی گھنٹے دو گھنٹے ایک دن دو دن میں تمام اعضاء کی حیات ختم ہوجاتی ہے، آلۂ مصنوعی آلۂ تنفس سے دوسرے اعضاء جیسے پھیپھڑا اور قلب وغیرہ کی حرکت کچھ مدت کے لئے دراز کی جاسکتی ہے؛ لیکن بہر حال موت واقع ہو ہی جاتی ہے اور حیات مستقرہ کا لوٹنا ناممکن ہوتا ہے۔

(۱) الدر المختار علی ہامش الرد، کتاب الذبائح: ۹/ ۴۴۸، مکتبہ زکریا۔

دماغی موت کی تاریخ

دماغی موت کے اس تصور کو سب سے پہلے ایک فرانسیسی میڈیکل کالج کے ڈاکٹروں کی ٹیم نے ۱۹۵۹ء میں پیش کیا، جسے فرانس کی وزارت صحت نے توثیق کرنے کے بعد ۱۹۶۸ء سے اپنے یہاں نافذ العمل قرار دیا، اس کے بعد امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی نے ۱۹۶۸ء میں ایک کمیٹی تشکیل دی، جس نے تحقیق کے بعد دماغی موت کی تفصیلات مرتب کی، ۱۹۷۱ء میں مینسوٹا یونیورسٹی کے ماہرین نے بھی اس طرح کی تفصیلات مرتب کی، ۱۹۸۱ء میں امریکی صدر رونالڈ ریگن نے ماہر ڈاکٹروں، معروف قانون دانوں اور بعض مذہبی پیشواؤں پر مشتمل ایک کمیٹی اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے تشکیل دی، اس نے بھی دماغی موت کی تصدیق کی۔

اس لئے راقم الحروف کے نزدیک مخ الدماغ کے مرنے کے بعد اسے مردہ تصور کیا جائے گا، گو کہ مصنوعی آلات تنفس کے ذریعہ قلب کی حرکت اور سانس کی آمد ورفت باقی رکھی گئی ہو۔

تفصیل سے معلوم ہوا کہ اصلی موت دماغ کی موت ہے؛ اس لئے اگر جذع المخ کام کر رہا ہو اور دوسرے اعضاء بہ شمول قلب و پھیپھڑا کام نہ کر رہے ہوں تو بھی اسے زندہ تصور کیا جائے گا؛ کیوں کہ اس میں داخلی طور پر ادراک وشعور کی صلاحیت موجود رہتی ہے اور اس کی واپسی کا امکان باقی رہتا ہے۔

آلۂ تنفس کے ہٹانے کا جواز

اگر مریض کی سانس مصنوعی آلۂ تنفس کی مدد سے چل رہی ہو اور قلب مشین کی مدد سے کام کر رہا ہو؛ لیکن جذع المخ کام نہ کر رہا ہو تو اطباء ایسے مریض سے مایوس ہو جاتے ہیں؛ کیوں کہ دماغی خلیوں کے مرنے کے بعد اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا امکان ختم ہو جاتا ہے، اس لئے اس صورت میں مصنوعی آلات تنفس ہٹا لینے میں مضائقہ نہیں اور یہ آلات ہٹانے والا قاتل بھی نہیں سمجھا جائے گا؛ لیکن اگر اطباء مریض سے مایوس نہ ہوئے ہوں اس بنیاد پر کہ ابھی جذع المخ زندہ ہے، یا جذع المخ کے زندہ ہونے کا یقین تو نہ ہو؛ لیکن دوسرے قرائن سے اس کے زندہ ہونے کا غالب گمان ہو تو اسے زندہ تصور کیا جائے گا اور ایسے مریض کی جان کی حفاظت کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنا ضروری ہوگا، اب اگر ڈاکٹر یہ بتلائے کہ اگر مصنوعی آلۂ تنفس لگا رہا تو مریض کے صحیح ہو جانے کا غالب گمان ہے اور اقارب بھی علاج کا خرچ برداشت کر سکتے ہوں تو مصنوعی آلۂ تنفس کو ہٹانا جائز نہ ہوگا۔

لیکن اگر ڈاکٹر کو مریض کے صحیح ہونے کی ہلکی سی اُمید ہو، یا مریض کے اقارب اس گراں علاج کے متحمل نہ ہوں تو اس صورت میں مصنوعی آلۂ تنفس ہٹا لینے کی اجازت ہوگی اور مشین ہٹانے کی وجہ سے موت واقع ہو جائے

تو اسے قاتل نہیں سمجھا جائے گا ؛ کیوں کہ جب علاج سے فائدہ حاصل ہونا یقین اور ظن غالب کے درجہ سے کم ہو تو علاج کرنا مباح ہے اور مصنوعی آلۂ تنفس لگانا بھی ایک علاج ہے اور اس حالت میں علاج ترک کردینے کی اجازت ہے۔

اگر اطباء مریض کی حیات سے مایوس ہوگئے ہوں، اس بنیاد پر کہ جذع المخ زندہ نہیں ہے تو مصنوعی آلۂ تنفس لگانا فضول ہے؛ کیوں کہ دماغی خلیوں کے مرنے کے بعد حیات کی واپسی ممکن نہیں، اور اگر جذغ المخ کے زندہ ہونے اور نہ ہونے کا علم نہ ہو؛ لیکن ڈاکٹر اس مریض سے مایوس ہوچکے ہوں تو چوں کہ مصنوعی آلۂ تنفس سے حیات کی واپسی مظنون سے بھی کم درجہ میں ہے، اس لئے مصنوعی آلۂ تنفس لگانا محض جائز ہوسکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا، اصل موت جذغ المخ کا مرنا ہے، اس لئے موت کے احکام یعنی وصیت کا نفاذ اور میراث کا اجراء جذغ المخ کی موت کے بعد کیا جاسکتا ہے، نیز عدت کا آغاز بھی اسی وقت سے سمجھا جائے گا۔

یوتھینزیا

ہر شخص کی جان اس کے پاس امانت ہے، وہ اس میں تصرف بے جا کا مالک نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے رحم مادر میں انسانی قالب بنا کر اس میں رُوح بھیجی اور اس کے لئے ایک وقت مقرر فرمایا کہ کب تک اسے دنیا میں رہنا ہے، جب وقت مقررہ آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے وصول فرمالیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ اس امانت میں اللہ کی مرضی کے خلاف کچھ کرے، اگر کوئی سخت تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہو، تکلیف نا قابل برداشت ہو یا ایسی بیماری لاحق ہو جو نا قابل علاج ہو یا وہ بیماری نا قابل علاج ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے صرفے کا باعث ہو، ان تمام وجوہ کی بنیاد پر ایسی تدبیر کرنا جو موت تک پہنچادے، مثلاً ایسا انجکشن دے دیا جائے کہ اس کی موت واقع ہوجائے یا ایسی دوا کھلا دی جائے جو موت کا باعث ہو درست نہیں ہے؛ بلکہ سخت حرام ہے کہ یہ قتل نفس کے دائرے میں آتا ہے، حدیث شریف میں صراحت ہے کہ نا قابل برداشت تکلیف کی بنیاد پر کوئی خودکشی کرلے تو اسے قتل نفس کا گناہ ہوگا، جو جہنم کا موجب بنے گا؛ چنانچہ غزوۂ حنین کے موقع رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کے بارے میں فرمایا کہ وہ جہنمی ہے؛ لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو اس نے بڑی بہادری دِکھائی اور پھر مرگیا اور لوگوں کی زبان پر اس کے لئے تحسین کے کلمات جاری ہونے لگے، رسول اللہ ﷺ کو اس کی موت کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں ہے، اس خبر سے بعض مسلمانوں کو شک ہونے لگا کہ ایسا شخص جہنمی کیوں کر ہوسکتا ہے؟ لیکن کچھ وقفہ سے معلوم ہوگیا کہ اسے لڑتے ہوئے سخت زخم آئے تھے، جس کی تکلیف برداشت نہ کرسکا اور خودکشی کرلی، اسی بنیاد پر حضور ﷺ نے جہنم کی پیشین گوئی فرمائی تھی، حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

عن أبی هریرة قال : شهدنا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم حنینا ، فقال (علیه السلام) لرجل : ممن یدعی بالاسلام هذا من أهل النار ، فلما حضرنا القتال قاتل الرجل قتالا شدیدا فأصابته جراحة ، فقیل یا رسول الله (صلی الله علیه وسلم) الرجل الذی قلت له اٰنفا إنه من أهل النار فإنه قاتل الیوم قتالا شدیدا وقد مات ، فقال النبی صلی الله علیه وسلم : إلی النار فکاد بعض المسلمین أن یرتاب فبیناهم علی ذالک إذ قیل : فإنه لم یمت ولکن به جراحاً شدیداً فلما کان من اللیل لم یصبر علی الجراح فقتل نفسه ، فأخبر النبی صلی الله علیه وسلم فقال : الله اکبر أشهد إنی عبد الله ورسوله ۔ (۱)

حدیث شریف صریح ہے کہ کسی مصیبت کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کرنا درست نہیں ہے، جب کوئی خود اپنے آپ کو ہلاک نہیں کرسکتا تو دوسروں کو کیوں کر اختیار ہوگا کہ وہ ایسے مریض کو کسی تدبیر کے ذریعہ موت کی نیند سلادے؛ لہٰذا انجکشن، دوا یا اس طرح کی کسی اور چیز کے ذریعہ مریض کی جان لینے والا قاتل نفس شمار ہوگا۔

ترکِ علاج

ایسے مریض سے نجات پانے کی دوسری شکل ہے، جس میں کوئی عمل نہیں کیا جاتا ہے؛ بلکہ علاج چھوڑ دیا جاتا ہے تو کیا اس کی اجازت ہوگی؟ فقہاء نے عام طور پر علاج کو مباح قرار دیا ہے؛ کیوں کہ اس سے فائدہ کا ہونا یقینی نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ ظن کے درجہ میں ہوتا ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

بخلاف من امتنع من التداوی حتی مات فإنه لا یأثم لأنه لا یقین إن هذا الدواء یشفیه ولعله یصح من غیر علاج کما فی إختیار ۔ (۲)

برخلاف اس شخص کے جو علاج ومعالجہ سے رُک جائے، یہاں تک کہ مرجائے کہ وہ گنہگار نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس بات کا یقین نہیں تھا کہ یہ دوشفا پہنچائے گی ممکن تھا کہ وہ بغیر علاج کے صحیح ہوجاتا۔

(۱) مسلم، کتاب الایمان: ۱/ ۷۲۔ (۲) الأنہر شرح ملتقی الأبحر: ۲/ ۵۲۴۔

لیکن غور کیا جائے کہ فقہاء نے یہ بات کس پس منظر میں کہی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ فقہاء نے یہ بات فرض کر کے کہی ہے کہ علاج سے شفا کا ہونا یقینی نہیں ہے اور جب یقینی نہیں ہے تو ترک معالجہ کیوں کر گناہ ہوگا ؟ لیکن اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر تجربہ سے کسی مرض کا علاج سے ٹھیک ہونا یقینی یا قریب بہ یقین ہو، جیسا کہ آج کل بعض امراض کے علاج میں کہا جاتا ہے کہ وہ تیر بہ ہدف ہے، یعنی تجربہ کی روشنی میں دوا کے ذریعہ بعض مرض کا دُور ہونا تقریباً یقینی ہوتا ہے تو ایسے امراض کا علاج کرانا صرف مباح نہیں ہوگا ؛ بلکہ واجب ہوگا، جیسے غذا کے استعمال سے جان کی حفاظت ہوتی ہے اور نہ کھانے پر موت یقینی ہوتی ہے، اس لئے شریعت نے غذا کے استعمال کو فرض قرار دیا، یہاں تک حلال غذا نہ ہو تو حرام غذا کا استعمال فرض قرار دیا، اسی طرح علاج کا بھی حکم ہوگا کہ تجربہ کی روشنی میں جس علاج سے مرض کا دُور ہونا یقینی یا قریب بہ یقینی ہو اس کا علاج واجب ہوگا اور اس کا ترک گناہ کا باعث ہوگا اور جس علاج سے مرض کا دُور ہونا متحمل ہو، یعنی مرض دُور بھی ہوسکتا ہے اور نہیں بھی ، ایسی صورتوں میں علاج مباح ہوگا اور ترک پر گناہ نہیں ہوگا۔

لہٰذا کینسر، ایڈس اور اس طرح کے نا قابل علاج مرض کا علاج ضروری نہیں ہوگا ؛ لیکن اگر ایسے مریض کو دوسرا مرض لاحق ہوجائے ، مثلاً بچہ نا قابل علاج مرض میں مبتلا ہو، پھر اسے نمونیہ ہوگیا تو نمونیہ کا کامیاب علاج ہوتا ہے، اس لئے علاج کی طاقت رکھنے کے باوجود اس کا ترک گناہ کا باعث ہوگا، رسول اللہ ﷺ نے علاج ومعالجہ فرمایا اور صحابہ کو ہدایت دی کہ مرض کا علاج کیا کرو ؛ چنانچہ حضرت اسامہؓ سے مروی ہے :

قال : قالت الأعراب : يا رسول الله ! ألا فتداوى ؟ قال : نعم يا عباد الله تداووا فإن الله لم يضع داء إلا وضع له شفاءاً ۔ (۱)

بلکہ ایسی بھی صراحت فقہاء نے کی ہے کہ اگر سڑے ہوئے ہاتھ کا کاٹ دینا باقی جسم کی سلامتی کے لئے ضروری ہو تو ہاتھ کاٹنا ضروری ہے ؛ چنانچہ علامہ عزالدین بن عبدالسلام فرماتے ہیں :

و أما مالا يمكن تحصيل مصلحته إلا بإفساد بعضه حفظاً للروح ، إذا كان الغالب السلامة فإنه يجوز قطعها ، وإن كان إفساداً لما فيه من تحصيل المصلحة الراجحة وهو حفظ الروح ۔ (۲)

(۱) ترمذی: ۲/ ۲۴۔

(۲) قواعد الأحکام فی مصالح الأنام: ۷۸۔

جس مصلحت کا حصول کسی جزئی فساد پر موقوف ہو، اس جزئی فساد کو اس کلی مصلحت کی خاطر گوارہ کیا جائے گا، مثلاً اگر کسی شخص کے کے جسم کا کوئی حصہ سڑگل رہا ہے اور خطرہ ہے کہ اگر اسے کاٹا نہیں گیا تو جان چلی جائے گی، تو جان کی حفاظت کے لئے اس ہاتھ کا کاٹا جانا برداشت کیا جائے گا، بشرطیکہ ظن غالب یہ ہو کہ ہاتھ کاٹ دینے سے جان بچ جائے گی۔

انسانی جان کی حفاظت ضروریات دین میں داخل ہے، اس لئے حتی الامکان اسے بچانے کی کوشش کرنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ''۔(البقرۃ:۱۹۵)

اگر طبی تجربہ کی روشنی میں جس مرض کا کامیاب علاج ہونا یقینی یا ظن غالب کے درجہ میں ہو اور علاج نہ کرایا جائے تو یہ صورت بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے دائرہ میں آجائے گی، واللہ اعلم۔

● ● ●

بڑے شہروں میں مسافتِ سفر☆

خالد سیف اللہ رحمانی

سفر کے حالات چوں کہ بمقابلہ اقامت کے مختلف ہوتے ہیں، انسان کو خلاف معمول زندگی گزارنی پڑتی ہے اور ماحول کی اجنبیت اس کے لئے مشقت کا باعث ہوتی ہے؛ اسی لئے سفر کتنا بھی آرام دہ ہو، مشقت سے خالی نہیں ہوتا؛ اس لئے شریعت میں حالت سفر کے لئے بعض رُخصتیں رکھی گئی ہیں، ان سہولتوں کا تعلق مختلف فقہی ابواب سے ہے، اسی میں ایک مسئلہ سفر کی نماز کا ہے، کہ چار رکعت والی نمازیں حالت سفر میں دو رکعت ادا کی جائیں گی، یہ حکم بعض فقہاء کے یہاں بطور رُخصت کے ہے اور حنفیہ کے نزدیک بطور عزیمت کے؛ کیوں کہ اُم المؤمنین سیدنا حضرت عائشہؓ نے فرمایا: نمازیں ابتداءً دو دو ہی رکعتیں فرض کی گئی تھیں، حالت سفر میں وہ اسی طرح باقی رکھی گئیں اور حالت اقامت میں دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا:

> فرض الله الصلاة حين فرضها ركعتين ركعتين في الحضر والسفر فأقرت صلاة السفر و زيد في صلاة الحضر ۔ (۱)
>
> جب اللہ تعالیٰ نے نماز فرض کی تو حضر وسفر دونوں حالتوں میں دو رکعتیں فرض کیں، پھر سفر کی نماز تو اسی طرح باقی رکھی گئی اور حالت حضر کی نماز میں رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا۔

سفر سے متعلق جو سہولتیں ہیں، ان میں بعض تو مطلق سفر سے متعلق ہیں اور بعض ایک مخصوص مسافت یا اس سے زیادہ فاصلہ کے سفر سے، ایسی ہی رُخصتوں میں نماز میں قصر کا مسئلہ بھی ہے، پھر اس مسافت کے سلسلہ میں بھی اہل علم کے درمیان اختلاف ہے کہ تین منزلوں کا اعتبار ہوگا یا ایک متعین مسافت کا؟ پھر یہ مسافت اڑتالیس میل ہوگی یا پینتالیس میل؟ پھر میل سے میل شرعی مراد ہے یا میل انگریزی؟ لیکن اس وقت یہ اختلاف زیر بحث نہیں۔

☆ ۵-۷/اپریل ۲۰۰۸ء کو جامعہ شیخ علی متقیؒ برہان پور میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا سترہواں فقہی سیمینار منعقد ہوا تھا، یہ اسی موقع کے لئے لکھی گئی تحریر ہے۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء؟ حدیث نمبر: ۳۴۳۔

موجودہ دور میں شہر کا جو پھیلاؤ ہوگیا ہے، ماضی میں اس کا کوئی تصور نہیں تھا، جو بڑے شہر کہلاتے تھے، وہ بھی چند میل پر مشتمل ہوتے تھے؛ کیوں کہ صنعتی انقلاب سے پہلے ذریعۂ معاش کے اعتبار سے شہر اور دیہات میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا تھا، اگر شہر میں تجارت کو فروغ ہوتا تھا، تو دیہاتوں میں زراعت کے مواقع زیادہ تھے اور تجارت ہی کی طرح زراعت بھی آمدنی کا بہت اہم اور مفید ذریعہ تھا؛ اس لئے دیہاتوں سے شہر کی طرف لوگوں کی زیادہ آمد نہیں ہوتی تھی، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں پر مدینہ ہجرت کرنے کو واجب قرار دیا گیا؛ لیکن دیہات کے لوگ اپنے اپنے مقام پر رہنا چاہتے تھے؛ چوں کہ ان کی تربیت اور مدینہ کی آبادی بڑھانے کے لئے ان کا ہجرت کرنا ضروری تھا؛ اس لئے انھیں ہجرت کی تاکید کی جاتی تھی اور اس کی بیعت لی جاتی تھی، موجودہ دور میں تعلیمی اور معاشی سہولتیں شہروں میں سمٹ گئی ہیں، کاشتکاری کا روایتی طریقہ اب کارکرد نہیں رہا ہے، صنعتی انقلاب کے نتیجے میں شہروں اور دیہاتوں کے معیار زندگی میں غیر معمولی فرق ہوگیا ہے؛ اس لئے دیہاتوں سے ایک سیل رواں ہے، جو شہر کی طرف اُمڈا آرہا ہے؛ اسی لئے شہروں کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے، خود ہندوستان میں کئی شہر ایسے ہیں، جو ایک سو مربع کلومیٹر سے بھی زیادہ وسیع علاقہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔

اس صورت حال نے ایک اہم مسئلہ پیدا کر دیا ہے کہ اگر کسی شخص کی منزل اس کی جائے اقامت سے اڑتالیس میل پر ہو؛ لیکن اگلے چالیس میل تک کا علاقہ شہر میں شامل ہو اور شہر سے نکلنے کے بعد مثلاً پانچ میل پر اڑتالیس میل پورا ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں وہ مسافر سمجھا جائے گا یا مقیم اور شہر سے باہر نکلنے کے بعد اسے نماز میں قصر کرنا چاہئے یا اتمام؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔

قرآن مجید میں بعض احکامِ سہولت کو سفر سے متعلق کیا گیا ہے؛ لیکن مسافت سفر کی کوئی تحدید نہیں کی گئی ہے اور نہ یہ واضح کیا گیا ہے کہ کس مقام کو مبدءِ سفر سمجھا جائے گا؟ کیوں کہ سفر ایک معروف لفظ تھا اور اس زمانے میں شہر اور آبادی میں اتنا پھیلاؤ نہیں ہوتا تھا کہ اس کی وضاحت مطلوب ہو، اسی طرح احادیث میں اس بات کی وضاحت نہیں ملتی کہ کس جگہ کو مبدءِ سفر سمجھا جائے گا؟ اور اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی، فقہاء نے اپنے اجتہادات سے اس کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور جیسا کہ مذکور ہوا؛ چوں کہ اس زمانے میں آبادی کا پھیلاؤ بہت کم تھا؛ اس لئے انھوں نے زیادہ تر اس بات کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ نماز میں قصر کہاں سے شروع ہوگا؟ یعنی مبدءِ سفر متعین کرنے کے بجائے حکمِ سفر کہاں سے جاری ہوگا؟ اس پر بحث کی ہے؛ چنانچہ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ شہر کی عمارتوں سے آگے بڑھ جائے تو قصر کرے گا، اگر شہر سے کوئی محلہ متصل ہو تو اس سے بھی آگے بڑھ جانا ضروری ہوگا :

فقال : إن كان بينه وبين المصر أقل من قدر غلوة ولم يكن بينهما مزرعة يعتبر مجاورة الفناء أيضاً ، و إن كان بينهما مزرعة أو كانت المسافة بينه وبين المصر قدر غلوة يعتبر مجاوزة عمران المصر ، هذا إذا كانت قرية أو قرى متصلة بربض المصر لا يقصر حتى يجاوزها ، وفي الفتاوىٰ أيضاً إن كان في الجانب الذي خرج منه محلة منفصلة عن المصر وفي القديم كانت متصلة بالمصر لا يقصر حتى يجاوز تلك المحلة ، والحاصل أنه قد صدق مفارقة بيوت المصر مع عدم جواز القصر ، ففي عبارة الكتاب إرسال غير واقع ، ولو ادعينا أن بيوت تلك القرى داخلة في مسمى بيوت المصر اندفع هذا ؛ لكنه تعسف ظاهر ثم المعتبر مجاوزة بيوت الجانب الذي خرج منه ، فلو جاوزها وتحاذيه بيوت من جانب آخر ، جاز القصر ۔ (۱)

اگراس جگہ اور شہر کے درمیان ایک فرلانگ کی مقدار سے کم فاصلہ ہواور ان دونوں کے درمیان کھیتیاں نہ ہوں تو اس کو فناء شہر کا پڑوس تصور کیا جائے گا ، اور ان کے درمیان کھیت ہوں ، یا اس کے اور اس شہر کے درمیان ایک فرلانگ کا فاصلہ ہوتو (مسافر ہونے کے لئے) اس شہر کی عمارتوں سے آگے بڑھ جانے کا اعتبار ہوگا ، اور اگر ایک گاؤں ہو یا کچھ گاؤں ہوں ، جو فناء شہر سے ملے ہوئے ہوں ،تو جب تک ان سے آگے نہ بڑھ جائے ،قصر نہیں کرے گا ، نیز فتاویٰ میں یہ بھی مذکور ہے کہ جس جانب سے وہ نکل رہا ہے، ادھر شہر سے علاحدہ محلہ موجود ہو؛ حالاں کہ زمانۂ قدیم میں وہ شہر سے متصل رہا ہو،تو جب تک اس محلہ سے آگے نہ بڑھ جائے ،قصر نہیں ہے ، حاصل یہ ہے کہ کبھی شہر سے باہر نکلنا صادق آتا ہے،مگر قصر کی اجازت نہیں ہوتی ؛ لہٰذا کتاب میں جو مطلق تعبیر اختیار کی گئی ہے، وہ درست نہیں ہے، اور اگر ہم دعویٰ کریں کہ ان دیہاتوں کے مکانات بھی شہر کے مکانات کے مصداق میں داخل ہیں ،تو یہ

(۱) فتح القدیر: ۲/ ۸، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ المسافر۔

اعتراض دُور ہوسکتا ہے؛ لیکن اس میں جو تکلف ہے وہ ظاہر ہے، پھر معتبر اس جہت کے مکانات سے آگے بڑھنا ہے، جس سے وہ نکلا ہے، پس اگر وہ اس جہت کے مکانات سے آگے بڑھ گیا اور دوسری جہت کے مکانات اس کے مقابل میں موجود ہوں تو قصر جائز ہوگا۔

اس کی بھی صراحت کی گئی ہے کہ شہر کی جس جانب سے باہر نکلے، اس جانب کا اعتبار ہوگا، چاہے دوسری جانب میں اس کے محاذی حصہ میں عمارتیں موجود ہوں :

ثم يعتبر الجانب الذي فيه يخرج المسافر من البلدة لا الجوانب بحذاء البلدة حتى أنه إذا خلف البنيان الذي خرج منه قصر الصلوة ، و إن كان بحذاءه بنيان آخر من جانب آخر من المصر ۔ (۱)

بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ کوئی محلہ شہر سے متصل تھا؛ لیکن اب شہر اور اس محلہ کے درمیان فاصلہ پیدا ہوگیا اور وہ محلہ آباد ہو، تو احکام سفر جاری ہونے کے لئے اس محلہ سے بھی گزر جانا ضروری ہے :

قال في شرح المنية : فلا يصير مسافرا قبل أن يفارق عمران ما خرج منه من الجانب الذي خرج ، حتى لو كان ثمة محلة منفصلة عن المصر وقد كانت متصلة به لا يصير مسافرا ما لم يجاوزها ، ولو جاوز العمران من جهة خروجه وكان بحذائه محلة من الجانب الآخر يصير مسافرا ، إذ المعتبر جانب خروجه و أراد بالمحلة في المسألتين ماكان عامرا ، أما لو كانت المحلة خرابا ليس فيها عمارة فلا يشترط مجاوزتها في المسئلة الأولى ولو متصلة بالمصر كما لا يخفى ۔ (۲)

منیۃ المصلی کی شرح میں لکھا ہے کہ جس جانب سے نکل رہا ہے، جب تک اس جہت کی آبادی کو پار نہ کرلے، مسافر نہیں ہوگا، یہاں تک کہ اگر وہاں شہر سے ہٹا ہوا کوئی محلہ موجود ہو، جو پہلے شہر سے لگا ہوا تھا، تب بھی جب تک اس سے آگے نہیں بڑھ جائے،

(۱) تاتارخانیہ، کتاب الصلاۃ، الفصل الثانی والعشرون فی صلاۃ السفر : ۲/ ۴۹۴۔

(۲) ردالمحتار: ۲/ ۵۲۴، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ المسافر۔

مسافر نہیں ہوگا اور اگر اپنے باہر نکلنے کی جہت میں آبادی سے باہر آ گیا؛ حالاں کہ دوسری جانب اس کے مقابل محلہ موجود ہے تو مسافر ہوجائے گا، اس لئے کہ اعتبار اس جہت کا ہے، جس جہت سے وہ نکلے اور دونوں مسئلوں میں محلہ سے مراد وہ جگہ ہے جو آباد ہو، اگر محلہ ویران ہو، آباد نہ ہو تو پہلی صورت میں اس سے آگے بڑھنا مسافر ہونے کے لئے شرط ہے، چاہے وہ شہر سے متصل ہی کیوں نہ ہو۔

علامہ شامیؒ نے کبیری کی جو یہ عبارت نقل کی ہے، اس کے بظاہر الفاظ تو یہ ہیں کہ جب تک آبادی سے نکلے گا نہیں مسافر نہیں ہوگا؛ لیکن اصل میں وہاں مسافر ہونے سے احکام سفر کا جاری ہونا مراد ہے؛ کیوں کہ دوسرے فقہاء نے اسی مسئلہ کو ذکر کرتے ہوئے یہ تعبیر اختیار کی ہے کہ جب تک آبادی سے متجاوز نہ ہوجائے قصر نہیں کرے گا۔

فقہاء مالکیہ نے بھی عام طور پر مبدء سفر کی بات کو متعین کرنے کے بجائے اس بات پر بحث کی ہے کہ قصر کہاں سے کرے گا؟ اور خلاصہ یہی ہے کہ جب تک شہر کے مکانات خواہ آباد ہوں یا ویران، نیز آبادی کے متصل باغات سے نکل نہ جائے، قصر نہیں کرسکتا؛ چنانچہ علامہ مغربی (متوفی: ۹۵۴ھ) فرماتے ہیں :

و إن عدى البلدي البساتين المسكونة ، أي التي لا ينقطع عنها أهلها ، قال ابن عبد السلام في قول ابن حاجب : ويشترط في الشروع مجاوزة بناء خارج البلد وبساتينه التي في حكمه ، بناء خارج البلد هي الأرباض وبساتينه التي في حكمه من البساتين التي لا تنقطع عمارتها ، انتهى ، وليس المراد أن يكون أهلها ملازمين للسكنى بها ، وقد قال سند في تعليل اعتبار البساتين ؛ لأن عمارتها متصلة بعمارة القرية فهي من توابعها وقد يسكن فيها أهلها ، وقد قالوا : لو كان في طرف البلد مساكن خربت وخلت من السكان ، إلا أن أبنيتها قائمة ، لم يقصر حتى يجاوزها ، فبأن يعتبر ذلک في البساتين المسكونة القائمة البنيان والعمارة المتصلة أولى انتهى ، فهم من كلامه أن البساتين إنما تعتبر إذا كانت متصلة بالقرية ، وبذلک صدر أول المسألة ، فقال : و إذا كانت بساتين القرية متصلة لم يقصر حتى يفارقها ۔ (۱)

(۱) مواہب الجلیل: ۲/ ۴۹۲ - ۴۹۳، کتاب الصلاۃ، فصل صلاۃ السفر ۔

اگر شہر کا رہنے والا باغات سے آگے بڑھ جائے ، یعنی جن باغات سے ان کے مالکان کا رہائشی تعلق منقطع نہ ہو تو ابن عبدالسلام نے کہا ہے کہ ابن حاجب کے قول کے مطابق قصر شروع کرنے کے لئے شہر کے باہر کی عمارت اور شہر کے باغات —— جو شہر ہی کے حکم میں ہیں —— سے آگے بڑھنا ضروری ہوگا ، شہر کے باہر کی عمارتوں سے مراد جانوروں کے باڑے ہیں ، اور اس کے حکم میں رکھے جانے والے باغات سے مراد وہ باغات ہیں ، جو ویران ہوئے ہوں ، یہ مراد نہیں ہے کہ باغات کے مالکان ہمیشہ وہاں سکونت اختیار کرتے ہوں ، سند نے باغات کے من جملہ شہر شمار کئے جانے کی علت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی آبادی گاؤں کی آبادی سے متصل ہے ؛ لہٰذا وہ اس کے تابع کے درجہ میں ہے اور گاؤں والے بعض اوقات وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں ، فقہاء نے کہا ہے کہ اگر شہر کے کنارے مکانات ویران ہو گئے ہوں اور یہاں سے رہائش پذیر حضرات چلے گئے ہوں ؛ مگر اس کی عمارتیں باقی ہوں تو جب تک اس سے آگے نہ بڑھ جائے قصر نہیں کرے گا ؛ لہٰذا جن باغات میں رہائش اختیار کی جائے اور عمارت باقی ہو ، تو اس کے متصل آبادی سے آگے بڑھ جانا قصر کے درست ہونے کے لئے بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوگا ، مصنف کی اس گفتگو سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ باغات سے آگے بڑھ جانا اس وقت معتبر ہوگا ، جب کہ وہ گاؤں سے متصل ہوں ؛ چنانچہ شروع میں مصنف کا قول گزر چکا ہے کہ جب گاؤں کے باغات متصل ہوں تو ان باغات سے آگے بڑھے بغیر قصر کرنا درست نہیں ہوگا ۔

کم وبیش یہی مضمون خود امام مالکؒ سے بھی نقل کیا گیا ہے ، جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جب آبادی کے گھروں میں داخل ہو جائے ، یا اس سے قریب آ جائے تو قصر کرنا چھوڑ دے ، اور ابن قاسمؒ کا بیان ہے کہ امام مالکؒ نے قربت کی وضاحت نہیں فرمائی کہ کتنا قریب آنا مراد ہے ؟(۱)

فقہاء شوافع نے آبادی سے اس قدر دور ہونے کو احکام سفر کے جاری ہونے کا محل قرار دیا ہے ، جسے عرف میں دوری سمجھا جاتا ہے ، اور جو لوگ باغات وغیرہ میں آباد ہیں ، ان کے لئے اُس جگہ سے باہر نکلنا ضروری ہے ، جس جگہ کی طرف وہ منسوب کئے جاتے ہیں ؛ چنانچہ موسیٰ بن احمد مقدسیؒ فرماتے ہیں :

(۱) دیکھئے : المدونۃ الکبریٰ : ۱/ ۱۱۲ ، فی قصر الصلاۃ للمسافر ۔

إذا فارق خيام قومه أو بيوت قريته العامرة : سواء كانت داخل السور أو خارجه بما يقع عليه اسم المفارقة بنوع من البعد عرفاً لا الخراب إن لم يله عامر ، فإن وليه اعتبر مفارقة بنوع من البعد عرفاً لا الخراب إن لم يله عامر ، فإن وليه اعتبر مفارقة الجميع ، كما لو جعل مزارع وبساتين يسكنه أهله ، ولو في فصل النزهة ولو برزوا لمكان لقصد الاجتماع ثم بعد اجتماعهم ينشؤون السفر من ذلک المكان فلهم القصر قبل مفارقته في ظاهر كلامهم خلافاً لأبي المعاني ، ويعتبر في سكان قصور وبساتين ونحوهم مفارقة ما نسبوا إليه عرفاً ۔ (۱)

جب اپنی قوم کے خیموں یا اپنے آباد گاؤں کے گھروں سے — چاہے فصیل کے اندر ہو یا باہر — اتنا آگے بڑھ جائے ، جس کو ایک گونہ دوری کی وجہ سے عرف میں جدا ہوجانا کہتے ہیں ، (تو قصر کرے گا) اگر گاؤں ویران ہو چکا ہوتو اس کا اعتبار نہیں ، بہ شرطیکہ اس سے لگی ہوئی کوئی آبادی نہیں ہو ، اگر ویران گاؤں سے آبادی متصل ہوتو اس آبادی اور گاؤں دونوں کے باہر نکلنے کا اعتبار ہوگا (اور اس کے بعد ہی قصر کرنا جائز ہوگا) ، جیسا کہ اگر کھیتوں اور باغات میں رہائش اختیار کی جائے ، محلات اور باغات وغیرہ میں اس جگہ سے آگے بڑھ جانے کا اعتبار ہوگا ، جس مقام کی طرف وہ عرف میں منسوب کئے جاتے ہیں ۔

امام نوویؒ نے اس سلسلہ میں بعض ایسے احکام بیان فرمائے ہیں ، جن سے صورت مسئلہ کو سمجھنے میں سہولت ہوگی ؛ کہ اگر کوئی شخص صحراء میں رہتا ہوتو جس جگہ میں اس کا ٹھکانہ ہو اور جس جگہ کی طرف منسوب ہوتا ہو ، وہاں سے باہر نکلتے ہی احکام سفر شروع ہوجائیں گے ، نیز وادی لمبائی میں ایک مقام کے حکم میں نہیں ہے ، اگر لمبائی میں سفر کرے ، تو اس کی جائے رہائش جس نام سے معروف ہو ، اس سے نکلتے ہی قصر کرنا جائز ہوگا ، اسی طرح ایک پوری وادی چوڑائی میں ایک مقام کے حکم میں ہے اور خود امام شافعیؒ نے اس کی صراحت کی ہے ؛ لیکن اگر وادی چوڑائی میں بھی بہت پھیلی ہوئی ہو ، تو جس مقام پر اس نے قیام کیا ہو ، یا جس ٹولہ میں وہ آباد ہو ، اس سے باہر نکلنا قصر کے درست ہونے کے لئے کافی سمجھا جائے گا ؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

(۱) الاقناع : ۱/۲۷۶ ، کتاب الصلاۃ ، فصل فی القصر ۔

وأما المقيم في الصحاری فلا بد له من مفارقة البقعة التي فيها رحله وينسب إليه ، فإن سكن واديا وسافر في عرضه ، فلا بد من مجاوزة عرض الوادي ، نص عليه الشافعي ، قال الأصحاب : وهذا على الغالب في اتساع الوادي ، فإن أفرطت السعة لم يشترط إلا مجاوزة القدر الذي يعد موضع نزوله أو موضع المحلة التي هو فيها ، كما لو سافر في طول الوادي ۔ (۱)

فقہاء حنابلہ نے بھی بنیادی طور پر یہی لکھا ہے کہ شہر کی آبادی سے باہر نکلنے کے بعد ہی قصر شروع ہوگا، مگر اس کی تفصیل میں علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک شہر میں کئی محلے ہوں، جو ایک دوسرے سے الگ ہوں تو اپنے محلہ سے نکلتے ہی قصر کرنا درست ہوجائے گا :

و إن كان للبلد محال ، كل محلة منفردة عن الأخرى كبغداد ، فمتى خرج من محلته أبيح له القصر إذا فارق محلته ، و إن كان بعضها متصلا ببعض ، لم يقصر حتى يفارق جميعها ، ولو كانت قريتان متدانيتين فاتصل بناء إحداهما بالأخرى فهما كالواحدة و إن لم يتصل ، فلكل قرية حكم نفسها ۔(۲)

اگر شہر کے کئی محلے ہوں، ہر محلہ دوسرے سے الگ ہو، جیسے بغداد، تو محلہ سے باہر نکلتے ہی اس کے لئے قصر کرنا درست ہوگا ، اور اگر ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں ، تو جب تک ان سب سے الگ نہ ہوجائے قصر نہیں کرے گا ، اور اگر دو گاؤں الگ الگ رہے ہوں ، پھر ایک کی عمارت دوسرے سے آ ملے تو وہ دونوں ایک ہی گاؤں کے حکم میں ہوں گے، اور اگر ان میں اتصال نہ ہوا ہو تو ہر گاؤں کا مستقل حکم ہوگا۔

ان تصریحات سے جو بات واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ :

(۱) قرآن وحدیث میں اس بات کی کوئی صراحت یا اس کی طرف اشارہ نہیں ہے کہ سفر کی ابتداء کس مقام سے سمجھی جائے گی؟

---

(۱) روضۃ الطالبین: ۱/ ۳۸۰، کتاب الصلاۃ المسافر۔

(۲) المغنی: ۳/ ۱۱۳، کتاب الصلاۃ، فصل فی السفر ۔

(۲) چوں کہ گزشتہ زمانہ میں شہر کا پھیلاؤ موجودہ دور کی طرح نہیں تھا؛ اس لئے فقہاء نے مبدءِ سفر کی تعیین پر گفتگو نہیں کی ہے؛ البتہ احکام سفر کب سے جاری ہوں گے؟ اس پر بحث کی ہے۔

علماء ہند و پاک کی آراء اس سلسلہ میں مختلف ہیں، زیادہ تر حضرات نے شہر کی آخری حدود سے مسافت سفر کا اعتبار کیا ہے اور بعض حضرات نے جائے قیام سے مسافت سفر کا اعتبار کیا ہے، پھر ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ قصر کے احکام یہیں سے شروع ہوجائیں گے؛ چنانچہ استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ فرماتے ہیں :

جب اپنی آبادی سے باہر نکل جاوے تو نماز میں قصر شروع کردے۔(۱)

اور دوسرے نقطۂ نظر میں ابتداء سفر اور اجراء حکم سفر میں فرق کیا گیا ہے، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی عبارتوں سے اس کا اشارہ ملتا ہے؛ چنانچہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اپنے ایک فتویٰ میں فرماتے ہیں :

> اگر گھر سے نکلنے کے وقت اس نے ارادہ کیا تھا کہ اس کے دورہ میں منتہائے سفر فلاں مقام ہے کہ جو ۴۸ میل یا زیادہ جائے رہائش سے ہے تو قصر لازم ہے ورنہ نہیں۔(۲)

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا بیان ہے :

> ہیڈکوارٹر جہاں قیام رہتا ہے، وہاں سے مسافت سفر کا اعتبار ہوگا، وہاں سے ۳۶ میل کا ارادہ کر کے چلنے پر مسافر ہوجائے گا۔(۳)

اسی طرح کے ایک دوسرے مسئلہ میں فرماتے ہیں :

> یہ لوگ گھر سے سو میل کی مسافت کا قصد کر کے چلنے سے مسافر ہوں گے۔(۴)

اس قول کو مزید تقویت فقہاء حنابلہ کی مذکورہ رائے سے حاصل ہوتی ہے کہ اگر شہر کے کئی محلے ہوں، تو ہر محلے کو مستقل حیثیت حاصل ہوگی؛ اس لئے یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ :

(۱) مسافت کے حساب کے لئے مبدءِ سفر اس جگہ کو مانا جائے، جہاں سے سفر کی نیت سے نکل رہا ہو۔

(۲) قصر کا حکم اس جگہ سے ہو، جہاں شہر کے حدود ختم ہوتی ہیں، واللہ اعلم۔

● ● ●

---

(۱) نظام الفتاویٰ: ۶/ ۱۴۳، نماز مسافر کے احکام۔ (۲) فتاویٰ دارالعلوم: ۴/ ۴۸۴۔

(۳) کفایت المفتی: ۳/ ۳۷۶۔ (۴) کفایت المفتی: ۳/ ۳۷۷۔

آنسو—فوائد ومسائل

مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی ☆

انسانی جسم سے خارج ہونے والے اجزاء، اس کے راحت اور نقصان دہ اثرات سے سلامتی کا ذریعہ ہوتے ہیں، اگر یہ اجزاءجسم انسانی سے باہر نہ آئیں تو جسم کئی قسم کی بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے، پھران میں سے بعض اجزاءتو بہت سارے فوائد کے بھی حامل ہوتے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگران اجزاء کا اخراج نہ ہوتو ہم جہاں ان فوائد سے محروم رہیں گے، وہیں ہمارا جسم ان کے نقصان دہ اثرات سے غیر محفوظ نہ رہے گا، جس کا نتیجہ کئی قسم کی بیماریوں کے لپیٹ میں آنا ہے، انھیں اجزاء میں سے ایک آنسو بھی ہے۔

آنسو کو عربی میں ''دمع'' کہتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اسے رحمت قرار دیا ہے؛ چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، آنحضرت ﷺ کو آپ کی صاحبزادی (حضرت زینبؓ) نے یہ پیغام بھیجا کہ میرے ایک بچہ کا انتقال ہورہا ہے؛ لہٰذا آپ تشریف لائیں، حضور اکرم ﷺ نے انھیں سلام بھجوایا اور یہ دُعا پڑھی :

إن لله ما أخذ ، وله ما أعطى ، وكلٌّ عنده بأجل مسمى ۔

بے شک اللہ ہی کا ہے، جو اس نے لیا اور اسی کا ہے، جو اس نے دیا، اس کے پاس ہر چیز کا ایک متعین وقت ہے۔

اور صبر کرنے اور ثواب کی اُمید رکھنے کا حکم دیا، آپ ﷺ کی صاحبزادی نے دوبارہ قسم دے کر کہلا بھیجا کہ ضرور تشریف لائیں، نبی کریم ﷺ سعد بن عبادہ، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور زید بن ثابت وغیرہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہمراہ تشریف لائے، اس وقت بچہ کی سانس اکھڑ اکھڑ کر چل رہی تھی، (یہ دیکھ کر) آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، سعد بن عبادہؓ نے سوال کیا: یہ کیا ہے؟ (آپ تو میت پر رونے سے منع کرتے ہیں اور خود کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں) اس پر آپ ﷺ نے فرمایا :

☆ ہدیٰ چلڈرنس اکیڈمی بلیا پور، دھنباد، جھارکھنڈ۔

هذه رحمة جعلها الله فى قلوب عباده ، و إنما يرحم الله من عباده الرحماء ۔ (۱)

یہ تو ایک رحمت ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے قلوب میں رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے رحم کرنے والے بندوں پر رحم کرتا ہے۔

قرآن میں آنسو کا ذکر

قرآن واحادیث بھی اس کے ذکر سے خالی نہیں ہیں؛ چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۔ (۲)

اور جب اس (کتاب) کو سنتے ہیں جو (سب سے پچھلے) پیغمبر (محمد ﷺ) پر نازل ہوئی تو تم دیکھتے ہو کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں؛ اس لئے کہ انھوں نے حق بات پہچان لی اور وہ (اللہ کی جناب میں) عرض کرتے ہیں کہ اے رب! ہم ایمان لے آئے تو ہمیں ماننے والوں میں لکھ لے۔

نیز ایک دوسری آیت میں ہے :

وَلاَ عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لاَ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَناً اَلاَّ يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۔ (۳)

اور نہ ان (بے سروسامان) لوگوں پر (الزام) ہے کہ تمہارے پاس آئے کہ اُن کو سواری دو اور تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس پر تمہیں سوار کروں تو وہ لوٹ گئے اور اس غم سے کہ ان کے پاس خرچ موجود نہ تھا، اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

احادیث میں آنسو

بہ کثرت احادیث میں آنکھ سے آنسو نکلنے کا ذکر موجود ہے، یہاں دو چار کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) بخاری، باب قول النبی ﷺ: يعذب الميت ببكاء أهله عليه، حدیث نمبر: ۱۲۸۴۔

(۲) المائدۃ: ۸۳۔ (۳) التوبۃ: ۹۲۔

۱- غزوۂ موتہ کے موقع سے میدان کارزار کی حالت بتاتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا :

أخذ الراية زيد ، فأصيب ، ثم أخذها جعفر ، فأصيب ، ثم أخذها عبد الله بن رواحة ، فأصيب و إن عينى رسول الله صلى الله عليه وسلم لتذرفان ثم أخذها خالد بن الوليد من غير إمرة ، ففتح له ۔ (۱)

زید نے جھنڈا لیا، وہ شہید ہو گئے، پھر جعفر نے جھنڈا لیا، وہ (بھی) شہید ہو گئے، پھر عبداللہ بن رواحہؓ نے جھنڈا لیا، وہ (بھی) شہید ہو گئے، (راوی حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ) آپ ﷺ کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، پھر بغیر حکم کے حضرت خالد بن ولید نے جھنڈے کو تھاما تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں فتح عطا فرمایا۔

۲- حضرت سائب بن یزیدؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں :

أن النبى صلى الله عليه وسلم لما هلك ابنه طاهر ، ذرفت عين النبى صلى الله عليه وسلم ، فقيل : يارسول و ! بكيت ؟ فقال النبى صلى الله عليه وسلم : إن العين تذرف ، و إن الدمع يغلب ، و إن القلب يحزن ، ولا نعصى الله عزوجل ۔ (۲)

جب رسول اللہ ﷺ کے بیٹے طاہر کی وفات ہوئی تو آنحضرت ﷺ کی آنکھیں چھلک پڑیں، پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! آپ بھی روئے؟ تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: آنکھیں چھلک پڑیں، آنسو غالب آ گئے، دل غم زدہ ہے؛ لیکن ہم اللہ عزوجل کے نافرمان نہیں ہیں۔

۳- حضرت جابر عبداللہؓ فرماتے ہیں :

دخلنا مكة عند ارتفاع الضحى ، فأتى النبى صلى الله عليه وسلم باب المسجد ، فأناخ راحلته ، ثم دخل المسجد ، فبدأ بالحجر ، فاستلمه ، وفاضت عيناه بالبكاء ، ثم رمل ثلاثاً ، ومشى أربعاً ؛

(۱) صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۱۱۸۹۔

(۲) معجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر: ۶۶۶۷۔

حتی فرغ ، فلما فرغ قبل الحجر ، و وضع یدیہ علیہ ومسح بھما وجھہ ۔ (۱)

ہم چاشت کے وقت مکہ میں داخل ہوئے ، آپ ﷺ مسجد کے دروازہ پر آئے اوراپنی سواری کو بٹھایا ، پھر مسجد میں داخل ہوئے اور حجر اسود سے آغاز کیا ، اس کا استلام کیا، اس وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، پھر آپ نے تین مرتبہ رمل کیا، اور چار مرتبہ پیادہ پا چلے ؛ یہاں تک کہ فارغ ہوئے ،فراغت کے بعد حجر اسود کو بوسہ دیا، اس پر اپنا ہاتھ رکھا اور اپنے چہرے پر پھیر لیا۔

بطورِ مثال یہاں چند حدیثیں پیش کی گئیں، ورنہ ذخیرۂ احادیث میں آنسو کے ذکر کا بھی ذخیرہ موجود ہے۔

فوائد

ذہنی تناؤ اور دماغی صحت کو بڑھانے کے لئے ہنسا یقیناً مؤثر ہے؛ لیکن جسم انسانی سے نکلنے والا یہ نمکین پانی، جسے ہم بے قدری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، آج کی جدید تحقیق نے اس کے بھی اچھے خاصے فائدے ذکر کئے ہیں، حتیٰ کہ جاپانی ماہرین نے یہ مشورہ تک دے ڈالا ہے کہ ''ہر شخص کو ذہنی تناؤ کم کرنے کے لئے ہفتے میں کم از کم پندرہ منٹ رونا چاہئے''؛ لہٰذا آیئے انسانی جسم سے خارج ہونے والے اس نمکین پانی کے کچھ موٹے موٹے فوائد ہم بھی جانتے چلیں :

جسم سے زہریلے مادوں کا اخراج

انسانی جسم کے اندر کئی طرح کے ہارمونس (Hormones) ہوتے ہیں، یہ ہارمون کبھی مفید تو کبھی مضر بھی ہوتے ہیں، ان ہارمونس میں ایک کورٹیسول (Cortisol) بھی ہے، یہ ذہنی دباؤ کے شکار رہنے والے افراد کے دماغ اور جسم کے لئے نقصان کا باعث بنتا ہے، رونے سے اس ہارمون میں کمی آتی ہے، جس کی وجہ سے انسان اس کے مضر اثرات سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

جذباتی تکالیف سے نجات

جذباتی تکلیف (Emotional Distress) بعض دفعہ جسمانی تکلیف سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے، اس تکلیف کو کم کرنے کا قدرتی ذریعہ ''رونا'' ہے؛ کیوں کہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ رونے کی وجہ سے دماغ کے اندر موجود جذباتی تکلیف میں اضافہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے نیوروٹرانس میٹرز (Neurotansmitters) میں کمی واقع ہوتی ہے، جس کے سبب انسان کو جذباتی تکلیف سے نجات ملتی ہے۔

---

(۱) المستدرک للحاکم، حدیث نمبر: ۱۶۷۱۔

جراثیم کش

جسم انسانی میں کئی قسم کے خطرناک بیکٹریاز بھی موجود ہیں، جن کے اخراج کے اللہ تعالیٰ نے کئی ذرائع بنائے، جس کی وجہ سے انسان کی صحت متاثر نہیں ہوتی، اگر ان کا اخراج رُک جائے تو پھر جسم انسانی بیماری کا شکار بن جاتا ہے، انسانی جسم کے اندر لائسوزائم (Lysozyme) نامی ایک خطرناک قسم کا بیکٹریا بھی ہے، جس کے اخراج کا ذریعہ ''رونا'' ہے؛ لہٰذا رونا جراثیم کش بھی ہے، جو لائسوزائم نامی بیکٹریا کو انسان کے جسم سے باہر نکالتا ہے اور بیماری سے بچاتا ہے۔

بوجھل طبیعت سے چھٹکارا

فکر کا ہجوم، کام کی کثرت اور تسلسل کے ساتھ سعی ناکام انسان کی طبیعت کے اندر اضمحلال پیدا کر دیتا ہے، جس کو دُور کرنے کا ایک قدرتی ذریعہ آنسو بہانا ہے، اگر طبیعت کی پژمردگی کے باوجود انسان اپنی آنکھ سے آنسو نہیں بہاتا ہے تو یہ اس کے جسم کے لئے نقصان دہ ہوسکتا ہے، کبھی بلڈ پریشر، ذیابطیس اور امراضِ قلب لاحق ہونے کے خدشات پیدا ہوجاتے ہیں؛ لیکن آنسو ان خدشات سے نجات دے کر طبیعت کے اضمحلال کو دُور کر دیتا ہے کہ یہ جسم انسانی میں موجود کولیسٹرول اور ذہنی دباؤ کو کم کرتا ہے، جو ان خدشات کے اصل اسباب میں سے ہیں۔

بینائی میں اضافہ

آنسو آنکھ کی پتلی اور دیدے کو نمی فراہم کرتا ہے، جس سے انسانی بینائی کو تقویت ملتی ہے، نیز آنسو روک کر رکھنے سے آنکھوں میں ڈی ہائڈریشن (Dehydration) ہوجاتی ہے، جو بینائی کی کمزوری کا ایک سبب ہے، اگر ہفتہ میں ایک بار رو لیا جائے تو یہ کمزوری ختم ہوجاتی ہے اور بینائی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

نومولود بچوں کی نشوونما

طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ نومولود یا پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے رونا صحت مندی کی علامت ہے، جو اس کی نشوونما کے لئے نہایت ضروری ہے، نہ رونے والے بچہ کی نشوونما متاثر ہوتی ہے اور وہ جسمانی طور پر کمزور ہوجاتا ہے۔

قوت مدافعت میں استحکام

انسانی جسم کی صحت کا مدار اس کی قوت مدافعت پر ہوتا ہے، قوت مدافعت جتنی طاقتور ہوگی، جسم بیماریوں

سے اتنا ہی دُور رہے گا، یہی وجہ ہے کہ جو انسان حادثات پر بھی نہیں روتا، وہ ذہنی طور پر معذور ہوتا ہے، ایک تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ایمونیا سسٹم بنانے کے قدرتی کیمیکلز رونے کی وجہ سے اخراج کرتے ہیں، جس سے قوت مدافعت کے اندر استحکام اور مضبوطی آتی ہے۔

دِلی سکون کا ذریعہ

بعض دفعہ انسان غم کی شدت میں ہوتا ہے اور بے کیف طبیعت کے ساتھ وہ اُلجھن میں پڑ جاتا ہے، ایسے وقت میں اگر آنکھوں سے آنسو بہا لیا جائے تو غم کی شدت کم ہو جاتی ہے اور یہ دلی سکون کا باعث بنتا ہے۔

آنسو کے فوائد جان لینے کے بعد آیئے اس سے متعلق کچھ مسائل اور ان کے احکام پر بھی نظر ڈال لیتے ہیں :

اللہ کی یاد میں آنسو بہانا

اس دنیا میں بسنے والے لوگوں میں سے کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کی آنکھ سے آنسو نہیں نکلتے ؛ کیوں کہ یہ آنسو جہاں بات منوانے کا ذریعہ ہیں، وہیں غلطیوں کی معافی کا سبب بھی ہیں۔

کچھ لوگ دنیاوی غرض کے لئے آنسو بہاتے ہیں ؛ لیکن خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کی آنکھوں سے نمکین پانی کا قطرہ اپنے رب کے ڈر کی وجہ سے نکلتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خالق کائنات کو اپنے بندے کی آنکھوں سے ٹپکنے والا آنسو کا قطرہ بڑا پیارا لگتا ہے؛ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے :

ما من قطرة أحب إلى الله عزوجل من قطرة دمع من خشية الله ـ (۱)

اللہ کے خوف سے ٹپکائے ہوئے آنسو کے قطرہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی قطرہ محبوب نہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اس آنسو کی بھی قدردانی کرتا ہے، جو اس کی یاد میں گرایا جائے؛ چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے :

سبعة يظلهم الله فى ظله ، يوم لاظل إلا ظله . . . و رجل ذكر الله خالياً ففاضت عيناه ـ (۲)

سات (خوش نصیب) لوگ ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ اپنا سایہ اس (قیامت کے) دن

(۱) کتاب الزہد والرقائق لابن المبارک، باب ماجاء فی الشح، حدیث نمبر: ٦٧٢، نیز دیکھئے: شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر: ۷۹۵۵۔

(۲) بخاری، باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلاۃ، حدیث نمبر: ٦٦٠۔

نصیب کرے گا، جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا......(ان میں سے)
ایک وہ شخص ہوگا، جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا، جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں
اشک بار ہوگئیں۔

معلوم ہوا کہ اللہ کے ڈر سے اور اس کی یاد میں آنسو بہانا ایک ایسا مبارک عمل ہے، جس کی بھرپور قدر دانی بذاتِ خود اللہ تبارک وتعالیٰ کرتا ہے؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے اس کی توفیق مانگتے رہنا چاہئے، اللہ عزوجل ہمیں اس کی توفیق دے، آمین!

آنسو پاک ہے یا نجس؟

آنسو جسم انسانی سے خارج ہونے والی ان اشیاء میں سے ہے، جسے پاک قرار دیا گیا ہے، حنبلی فقیہ شمس الدین محمد بن عبداللہ زرکشیؒ لکھتے ہیں :

الخارج من الإنسان ثلاثة أقسام : (طاهر) بلا نزاع ، وهو الدمع ، والعرق ، والريق ، والمخاط ، والبصاق ـ (١)
انسان کے جسم سے تین قسم کی چیزیں خارج ہوتی ہیں (پہلی قسم) بغیر کسی اختلاف کے پاک ہے اور وہ آنسو، پسینہ، تھوک، رینٹ ہے۔

تحفۃ الفقہاء میں ہے :

فإن كان الخارج طاهراً مثل الدمع ... لا ينقض الوضوء بالإجماع ـ (٢)
اگر (سبیلین کے علاوہ جسم کے دوسرے حصے سے) خارج ہونے والی چیز پاک ہے، جیسے: آنسو......تو بالاجماع وضو نہیں ٹوٹے گا۔

کیا آنسو نکلنے سے وضو ٹوٹتا ہے؟

آنسو کا شمار اُن اجزاء میں ہے، جو نہ خود نجس ہے اور نا ہی نجاست والی جگہوں سے گزر کر نکلتا ہے؛ اس لئے اس کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، مشہور فقیہ علاء الدین سمرقندیؒ لکھتے ہیں :

---

(١) شرح الزرکشی، فی بحث بول الآدمی وبول الحیوان غیر مأکول: ٢/ ٣٩۔

(٢) تحفۃ الفقہاء، باب الحدث: ١/ ١٨۔

فإن كان الخارج طاهراً مثل الدمع والريق والمخاط والعرق واللبن ونحوها ، لا ينقض الوضوء بالإجماع ۔ (١)

اگر (سبیلین کے علاوہ جسم کے کسی حصہ سے) خارج ہونے والی چیز پاک ہے، جیسے: آنسو، تھوک، رینٹ، پسینہ اور دُودھ وغیرہ تو بالا جماع وضو نہیں ٹوٹتا۔

لیکن چوں کہ یہ خالص پانی نہیں ہے؛ اس لئے اس سے وضو درست نہیں ہوگا، حضرت عطاؒ فرماتے ہیں :

لا وضوء من دمع عين ولا مما سال من الأنف ۔ (٢)

نہ تو آنکھ کے آنسو سے وضو (درست) ہوگا اور نا ہی ناک سے بہنے والی چیز سے۔

اگر بیماری کی وجہ سے مسلسل آنکھ سے آنسو آئے؟

عموماً جن امراض کی بنیاد پر آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتا رہتا ہے، وہ تین ہیں :

١- ''رمد'' یعنی آشوب چشم، جسے آنکھ آنا بھی کہا جاتا ہے۔

٢- ''عمش'' یعنی آنسو کے اکثر اوقات بہنے کی وجہ سے ضعف بصارت۔

٣- ''غرَب'' یعنی آنکھ کا اندرونی ورم یا پھنسی۔

اگر کسی کو ''رمد'' یعنی آشوبِ چشم یا ''عمش'' یعنی آنسو کے اکثر اوقات بہنے کی وجہ سے ضعف بصارت کا مرض ہوجائے، جس کی وجہ سے مسلسل آنسو نکلے، تو اس آنسو سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؛ البتہ آنسو کے تسلسل کی وجہ سے یہ شخص ''معذور'' کے حکم میں ہوگا، ملا خسروؒ لکھتے ہیں :

في عينه رمد أو عمش ، إن خرج منها الدمع نقض ، و إن استمر صار صاحب عذر ۔ (٣)

آنکھ میں رمد (آشوب چشم) یا عمش (آنکھوں سے پانی جاری رہنے کی بیماری) ہو، اگر اس سے آنسو نکلے تو وضو ٹوٹ گیا اور اگر آنسو نکلنے میں تسلسل ہو جائے تو وہ صاحبِ عذر ہوگیا۔

---

(١) تحفۃ الفقہا، باب الحدث: ١٨/١۔

(٢) مصنف عبدالرزاق، اثر نمبر: ٥٥٩۔

(٣) دررالحکام شرح غرر الحکام، نواقض الوضوء: ١٦/١۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ آنسو کے تسلسل کی وجہ سے کچ لہو کا احتمال ہوتا ہے؛ اس لئے ہر نماز کے وقت کے لئے استحبابی طور پر وضو کرنے کا حکم دیا جائے گا؛ البتہ طبی ذرائع یا علامات سے غلبۂ ظن ہو جائے کہ یہ کچ لہو ہی ہے تو پھر ہر نماز کے وقت میں وضو کرنا واجب ہوگا، وہ رقم طراز ہیں :

فی عینه رمد يسيل دمعها يؤمر بالوضوء لكل وقت لاحتمال كونه صديدا ، وأقول : هذا التعليل يقتضى أنه أمر استحباب ، فإن الشك والاحتمال فى كونه ناقضاً لا يوجب الحكم بالنقض ، إذا ليقين لا يزول بالشك ، والله أعلم ، نعم إذا علم من طريق غلبة الظن بإخبار الأطباء أو علامات تغلب ظن المبتلى يجب ۔(۱)

آشوبِ چشم کی وجہ سے آنسو بہتا ہو تو خون ملی پیپ کے احتمال کی وجہ سے ہر (نماز کے) وقت کے لئے وضوء کا حکم دیا جائے گا، میں (علامہ ابن ہمامؒ) کہتا ہوں: یہ علت استحبابی حکم کا تقاضہ کرتی ہے؛ کیوں کہ ناقض ہونے کے سلسلہ میں شک واحتمال نقض کے حکم کو واجب نہیں کرتا کہ یقین شک کے ذریعہ سے ختم نہیں ہوتا، واللہ اعلم، ہاں غلبۂ ظن سے معلوم ہو جائے اس طور پر کہ ڈاکٹروں نے بتلایا ہو یا ایسی علامات ہوں، جن سے مبتلیٰ (مریض) کو غلبۂ ظن حاصل ہو جائے تو (ہر نماز کے وقت کے لئے وضو) واجب ہے۔

جہاں تک ''غَرَب''، یعنی آنکھ کا اندرونی ورم یا پھنسی کا تعلق ہے تو اس سے نکلنے والے پانی سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا اور تسلسل کے ساتھ نکلنے کی صورت میں وہ شخص بھی ''معذور'' کے حکم میں ہو کر ہر نماز کے وقت کے لئے وضو کرے گا، علامہ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں :

وفى التجنيس : الغَرَب فى العين إذا سال منه ماء نقض ؛ لأنه كالجرح وليس بدمع ۔(۲)

''تجنیس'' میں ہے کہ آنکھ کے ''غرَب'' (یعنی آنکھ کا اندرونی ورم یا پھنسی) سے جب پانی بہے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے؛ کیوں کہ یہ زخم کی طرح ہے، آنسو نہیں۔

(۱) شرح فتح القدیر، فصل فی الاستحاضۃ: ۱/ ۱۸۷۔

(۲) شرح فتح القدیر، فی نواقض الوضوء: ۱/ ۶۲۔

اگر دورانِ نماز آنسو نکل آئے؟

اگر دورانِ نماز آنسو نکل آئے تو اس کی دو صورتیں ہیں :

۱- آنسو بغیر آواز کے نکلے، ایسی صورت میں نماز فاسد نہیں ہوگی۔

۲- آنسو آواز کے ساتھ نکلے اور آواز اتنی بلند ہو کہ حروف ظاہر ہو جاتے ہوں تو اس کی دو نوعیتیں ہیں :

(الف) جنت اور دوزخ کے ذکر کی وجہ سے ہو، ایسی صورت میں نماز فاسد نہیں ہوگی۔

(ب) مصیبت اور تکلیف کی وجہ سے ہو، ایسی صورت میں نماز فاسد ہو جائے گی، علامہ اوزجندیؒ رقم طراز ہیں :

ولو بكى في صلاته ، فإن سال دمعه من غير صوت ، لا تفسد صلاته ، و إن ارتفع صوته فحصل به حروف ، إن كان من ذكر الجنة والنار ، لم تفسد صلاته ، و إن كان من وجع ، أو مصيبة تفسد صلاته ۔ (۱)

اگر نماز میں روئے، پس اگر آنسو بغیر آواز کے نکلے تو نماز فاسد نہیں ہوگی؛ (لیکن) اگر آواز اتنی بلند ہو کہ حروف ظاہر ہو جاتے ہوں تو اگر جنت و دوزخ کے ذکر کی وجہ سے ہو تو نماز فاسد نہیں ہوگی اور اگر کسی درد و تکلیف کی وجہ سے ہو تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

اگر روزہ کی حالت میں آنسو منہ میں داخل ہو جائے؟

اگر روزہ کی حالت میں آنسو منہ میں چلا جائے اور اس کی نمکینی محسوس ہو تو روزہ ٹوٹ جائے گا، اگر نمکینی محسوس نہ ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا، علامہ اوزجندیؒ لکھتے ہیں :

ولو دخل دمعه ، أو عرق جبهته ، أو دم رعافه حلقه فسد صومه ۔ (۲)

اگر (روزہ دار کے) حلق میں آنسو یا پیشانی کا پسینہ یا نکسیر کا خون داخل ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

---

(۱) فتاویٰ قاضی خاں علی ہامش الہندیہ، فصل فیما یفسد الصلاۃ: ۱/۱۳۶۔

(۲) فتاویٰ قاضی خاں علی ہامش الہندیہ، فیما یفسد الصوم: ۱/۲۱۱۔

حلق میں ان چیزوں کے داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نمکینی محسوس کی جائے؛ چنانچہ علامہ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں :

والأولى عندي الاعتبار بوجدان الملوحة لصحيح الحس ؛ لأنه لا ضرورة في أكثر من ذلك القدر ۔ (١)

میرے نزدیک صحیح الحس شخص کے لئے نمکینی محسوس ہونے کا اعتبار زیادہ بہتر ہے؛ کیوں کہ اس سے زیادہ مقدار کی ضرورت نہیں۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ یہاں آنسو سے مراد وہ آنسو ہے، جو ظاہری آنکھ سے آنے والا ہو، اگر مسامات کے ذریعہ سے حلق میں پہنچے تو تو اس کا حکم تھوک کا ہوگا، اگر چہ کہ اس کا مزا پورے منھ میں محسوس کیا جائے، علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں :

ثم في التعبير بالقطرة إشارة إلى أن المراد الدمع النازل من ظاهر العين ، أما الواصل إلى الحلق من المسام ، فالظاهر أنه مثل الريق ، فلا يفطر ، وإن وجد طعمه في جميع فمه ۔ (٢)

پھر ''قطرۃ'' کی تعبیر اختیار کرنے میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ''دمع'' سے مراد ظاہری آنکھ سے اُترنے والا آنسو ہے، اگر مسامات کے ذریعہ سے حلق میں پہنچے تو تو اس کا حکم تھوک کا ہوگا اگر چہ کہ اس کا مزا پورے منھ میں محسوس کیا جائے۔

میت پر آنسو بہانا

کسی کی موت کے بعد اس پر رونے اور آنسو بہانے کی دو صورتیں ہیں :

١- دھاڑیں مار کر یا لوگوں کو جمع کر کے یا پھر میت کی وصیت کی وجہ سے رونا: حدیث شریف میں اس کی سخت ممانعت آئی ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے تعلق سے فرمایا :

إن الميت ليعذب ببكاء أهله عليه ۔ (٣)

بلاشبہ میت پر گھر والوں کے رونے کی وجہ سے اس پر عذاب ہوتا ہے۔

---

(١) شرح فتح القدیر، کتاب الصوم، مایوجب القضاء والکفارۃ: ٢/ ٣٣٧۔

(٢) رد المحتار، کتاب الصوم: ٣/ ٣٧٨۔

(٣) بخاری، باب قول النبی ﷺ: یعذب المیت ببعض بکاء أہلہ علیہ......، حدیث نمبر: ١٢٨٦، مسلم، حدیث نمبر: ٩٢٧۔

چوں کہ ایسا کرنا نوحہ کے قبیل سے ہے، جو زمانۂ جاہلیت کے غلط رسوم میں سے ہے؛ اس لئے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

۲- شدتِ غم کی وجہ سے آنسو نکل آنا: یہ اُس رحم دلی کا تقاضہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں میں ودیعت کر رکھی ہے، خود آپ ﷺ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہوئے ہیں، جس کی تفصیل پیچھے حدیث میں گزر چکی ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے :

ألا تسمعون ؟ إن الله لا يعذب بدمع العين ولا بحزن القلب ۔ (۱)

کیا تم سنتے نہیں؟ اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسو اور دل کے غم کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا۔

فقہائے کرامؒ لکھتے ہیں :

ولا بأس بإرسال الدمع والبكاء من غير نياحة ۔ (۲)

بغیر نوحہ کے رونے اور آنسو بہانے میں کوئی حرج نہیں۔

معلوم ہوا کہ اگر کسی کا انتقال ہو جائے تو خاموش آنسوؤں کے رونے کی ممانعت نہیں ہے، چیخ چلا کر رونے کی ممانعت ہے کہ نوحہ کے مشابہ ہے۔

اجازتِ نکاح کے وقت آنسو نکلنا

اگر اجازتِ نکاح کے وقت لڑکی کی آنکھوں سے آنسو نکلے تو کیا اسے اجازت سمجھا جائے گا یا نکاح کو رد کرنا تصور کیا جائے گا؟ اس سلسلہ میں مسئلہ کی دو صورتیں ہیں :

۱- آنسو بغیر آواز کے نکلے، ایسی صورت میں اجازت سمجھی جائے گی اور اس کو گھر والوں سے جدائی پر آنسو بہانا سمجھا جائے گا، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں :

و أما إذا خرج الدمع من غير صوت ، لا يكون رداً ؛ لأنها تحزن على مفارقة بيت أبويها ، وعليه الفتوى ، و إنما يكون ذلک عند الإجازة ۔ (۳)

(۱) بخاری، باب البکاء عند المریض، حدیث نمبر: ۱۳۰۴۔

(۲) فتح القدیر، الصلاۃ علی المیت: ۳/ ۳۹۵، البحر الرائق، شروط صلاۃ الجنازۃ: ۲/ ۱۹۵۔

(۳) منحۃ الخالق علی ہامش البحر الرائق، باب الأولیاء والأکفاء: ۳/ ۱۹۹۔

جہاں اس کا تعلق ہے کہ آنسو بغیر آواز کے نکلے تو یہ رد کرنا نہیں ہوگا؛ بلکہ اسے والدین کے گھر کو چھوڑنے پر غم کی وجہ سے سمجھا جائے گا، اسی پر فتویٰ ہے، اور یہ مسئلہ اجازت کے وقت کا ہے۔

۲- آنسو آواز کے ساتھ نکلے، ایسی صورت میں اجازت نہیں سمجھی جائے گی کہ عموماً ایسی شکل ناراضگی اورناپسندیدگی کے وقت پیش آتی ہے، علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں :

و إن كان بصوت فليس بإذن ؛ لأنه دليل السخط والكراهة غالباً ۔ (۱)

اگر آواز کے ساتھ ہوتو یہ اجازت نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ عموماً یہ راضگی اور ناپسندیدگی کی دلیل ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن ہمامؒ کی رائے کو پر عمل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں :

والمعول اعتبار قرائن الأحوال في البكاء والضحك ، فإن تعارضت ، أو أشكلت احتيط ۔ (۲)

ہنسنے اور رونے کے سلسلہ میں معتمد علیہ بات قرائن احوال کا اعتبار کرنا ہے، پس اگر تعارض یا اشکال واقع ہوتو احتیاط بہتر ہے۔

دُعا کے وقت آنسو بہانا

دُعا مانگنا اور گناہوں کی بخشش کا ایک اہم ذریعہ ہے؛ لہٰذا دُعا مانگتے وقت جس قدر مسکینی، عاجزی، درماندگی اور خوشامد ہوگی، قبولیت کے امکانات زیادہ ہوں گے، اپنی بے مائےگی کے اظہار کا ایک طریقہ گڑگڑانا اور آنسو بہانا بھی ہے؛ اس لئے دُعا میں آنسو بہانے کی کوشش کرنی چاہئے کہ یہ علاماتِ قبولیت میں سے ہے، فقہاء لکھتے ہیں :

ويجتهد على أن يخرج من عينيه قطرات من الدمع ، فإنه دليل القبول ۔ (۳)

اوردعا کے وقت آنکھوں سے آنسو نکالنے کی کوشش کرے کہ یہ قبولیت کی دلیل ہے۔

---

(۱) البحر الرائق، باب الأولياء والأكفاء: ۳/۱۹۹۔

(۲) فتح القدیر: ۳/۲۵۶۔

(۳) حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، ص: ۵۳۷، ردالمحتار، کتاب الحج: ۹/۱۷۶، فتح القدیر، کتاب الحج، مسائل منثورۃ: ۶/۲۵۷۔

ایسی تلاوت، جولوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری کردے

تلاوتِ قرآن کے سلسلہ میں حکم یہ ہے کہ :

زینو القرآن بأصواتکم ۔ (١)

قرآن کواپنی آواز سے مزین کرو۔

یعنی قرآن ایسی آواز میں پڑھو، جو سننے والے کے دل کوموہ لے، یہی وجہ ہے کہ تحسین صوت اور تزئین قراءت کوفقہاء نے مستحب قرار دیا ہے، علامہ عالم بن علاء دہلویؒ لکھتے ہیں :

إن کان الألحان لا یغیر الکلمة عن موضعها ، ولا یؤدی التغنی بها إلی تطویل الحروف التی حصل التغنی بها حتی لا یصیر الحرف حرفین ؛ بل یحسنه تحسین الصوت وتزیین القراءة ، لا یوجب ذلک فساد الصلاة ، و ذلک مستحب عندنا فی الصلاة وخارجها ۔ (٢)

اگرلحن کلمہ کواس کی جگہ سے نہ تبدیل کرے اورغنائیت حرف کواتنا طویل نہ کرے کہ ایک حرف دومعلوم ہونے لگے؛ بلکہ اس کی وجہ سے تحسین صوت اورتزئین قراءت ہوتی ہو، یہ فسادنماز کولازم نہیں، اور یہ ہمارے نزدیک نماز کے اندراور باہر(دونوں جگہوں میں)مستحب ہے۔

جس طرح علماء نے تحسین صوت اورتزئین قراءت کومستحب قرار دیا ہے، اسی طرح ایسی قراءت کرنے کو بھی مستحب قرار دیا ہے، جولوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگادے، علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں :

القراءة علی الوجه الذی یهیج الوجد فی قلوب السامعین ، ویورث الحزن ، ویجلب الدمع مستحبة مالم یخرجه التغنی عن التجوید ، ولم یصرفه عن مراعاة النظم فی الکلمات والحروف ۔ (٣)

---

(١) سنن أبی داؤد، حدیث نمبر: ١٤٦٨۔

(٢) الفتاوی التاتارخانیة: ١/ ٣١١۔

(٣) بریقة محمودیة فی شرح طریقة محمدیة وشریعة نبویة فی سیرة أحمدیة لأبی سعید محمد بن محمد الخادمی الحنفی: ٣/ ٢١٨۔

ایسے طریقہ پر قراءت کرنا، جو سامعین کے دلوں میں غم اور گھٹن پیدا کردے اور آنسوؤں کی لڑی لگادے، مستحب ہے، جب تک غنائیت تجوید (کے حدود) سے باہر اور حروف وکلمات میں نظم کی رعایت سے دُور نہ کردے (ورنہ قراءت مکروہ تحریمی ہوگی)۔

آنسو کی طرف طلاق کی اضافت (نسبت) کرنا

اگر طلاق دینے میں اعضاء واجزائے جسم کی طرف طلاق کی نسبت کر کے الفاظ استعمال کرے تو اس کی دو صورتیں ہیں :

۱- ان اعضاء کی طرف طلاق کی نسبت کرے، جن سے پورا جسم مراد لیا جاتا ہے، ایسی صورت طلاق واقع ہوجائے گی۔

۲- ان اعضاء (اجزاء) کی طرف طلاق کی نسبت کرے، جن سے لطف اندوز نہیں ہوا جاتا، ایسی صورت طلاق واقع نہیں ہوگی، علامہ ابن مازہ بخاریؒ لکھتے ہیں :

أن كل ما يعبر به عن جميع البدن نحو الرأس ، والرقبة ، والفرج ، والوجه يصح إضافة الطلاق إليه ، وكل جزء لا يعتبر به عن جميع البدن ، إن كان جزءاً لا يستمتع به نحو الدمع ، والريق ، والدم لا يصح إضافة الطلاق إليه بالاتفاق ـ (۱)

ہر وہ عضو، جس سے پورے جسم کی تعبیر ہوتی ہے، جیسے: سر، گردن، شرم گاہ اور چہرہ، ان کی طرف طلاق کی اضافت کرنا درست ہے اور ہر وہ جزء، جس سے لطف اندوز نہیں ہوا جاتا، جیسے: آنسو، تھوک اور خون، ان کی طرف طلاق کی اضافت درست نہیں۔

لہٰذا آنسو کی طرف طلاق کی اضافت (نسبت) کرنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

اگر کھانے پینے کی چیزوں میں آنسو گر جائے؟

اگر کھانے اور پینے کی کسی چیز میں آنسو گر جائے تو ان چیزوں کو کھانا اور پینا درست ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں مسئلہ کی دو نوعیتیں ہیں :

---

(۱) المحیط البرہانی، فیما یرجع إلی صریح الطلاق: ۳/ ۲۱۴۔

۱- عام حالت کے آنسو کھانے اور پینے کی اشیاء میں گریں، ایسی صورت میں کھانے اور پینے کی گنجائش ہے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے :

و یجوز أکل مرقة یقع فیها عرق الآدمی ، أو نخامته ، أو دمعه ۔ (۱)

ایسے شوربے کا استعمال جائز ہے، جس میں انسان کا پسینہ یا بلغم یا آنسو گر جائے۔

۲- امراض کی وجہ سے نکلنے والے آنسو کھانے اور پینے کی چیزوں میں گریں، ایسی صورت میں چوں کہ پیپ اور خون وغیرہ کی آمیزش کا احتمال رہتا ہے، جس کی وجہ سے ایسے آنسو کو نجس بھی قرار دیا گیا ہے؛ چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں :

وفی الخانیة : الغرب فی العین بمنزلة الجرح ، فما یسیل منه فهو نجس ۔ (۲)

خانیہ میں ہے کہ ''غَرَب''، یعنی آنکھ کا اندرونی ورم یا پھنسی زخم کے درجہ میں ہے، پس جو کچھ اس سے بہے، وہ نجس ہے۔

اس لئے ایسی صورت میں کھانے پینے کی چیزوں کو کھانے اور پینے کی اجازت نہیں ہوگی؛ البتہ کھانا اگر خشک اشیاء میں سے ہو تو آنسو گرنے کی جگہ اور اس کے اطراف کو دُور کرنے کے بعد کھانے کی گنجائش ہوگی، واللہ اعلم بالصواب!

● ● ●

(۱) الفتاویٰ الہندیہ، الباب الحادی عشر فی الکراہۃ فی الأکل وما یتصل بہ:۵/ ۴۱۸۔

(۲) ردالمحتار، نواقض الوضوء:۱/ ۲۸۰۔

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی بنیادی فکر اور موجودہ حالات میں اس کی معنویت

خالد سیف اللہ رحمانی

ہندوستان میں احیاء دین، دعوت واصلاح اور اسلام کے تحفظ کی جو بھی تاریخ لکھی جائے گی، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے ذکر کے بغیر ادھوری اور نامکمل ہوگی، وہ دل ودماغ کا حسین سنگم اور عقل ومعرفت کا خوبصورت امتزاج تھے، بزم علم وتحقیق کی شان بھی تھے اور تزکیہ واحسان کی مجلس کے میر مجلس بھی، دل کی دوا بھی دیتے تھے اور دماغ کی غذا بھی، قدرت نے ان کو بیک وقت دُور اندیشی، فراست ودانائی، بالغ نظری اور بیدار مغزی سے بھی نوازا تھا اور سوز دروں، ملت کی تڑپ اور دینی غیرت وحمیت سے بھی، دل کی دردمندی نے کبھی ان کو اپنے ماحول اور واقعی حالات سے غافل نہ کیا اور فراست ودانائی کبھی ان کی رسم درویشی سے آزاد نہ ہوسکی، ان کی شخصیت بہت ہی جامع الصفات تھی؛ لیکن ان کی بعض فکری جہتیں ایسی تھیں، جو آج بھی ہمارے لئے خضر طریق اور مشعل راہ ہیں، میں آج کی اس مجلس میں ان ہی پہلوؤں کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں، ضرورت ہے کہ علماء اس کو اپنے لئے حرز جاں بنائیں اور اس کی روشنی میں احیاء دین اور اصلاح اُمت کا فریضہ انجام دیں۔

پہلی چیز ان کی دینی غیرت وحمیت، حفاظت اسلام کی جدوجہد اور ہر طرح کے ارتدادی فتنوں کے مقابلہ کا جذبۂ بے پایاں ہے، دوسری خصوصیت: مدارس کے نظام ونصاب کی اصلاح اور علماء کو اپنے عصر کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی ترجمانی اہل بتانے کی فکر ہے، تیسرے: ملت کے اتحاد واتفاق کی کوشش۔

دِفاعِ اسلام

● ہندوستان پر انگریزوں نے اپنی فتوحات کے آغاز سے ہی عیسائیت کی تبلیغ کے لئے مشنریز کو متحرک کردیا تھا اور وہ بڑی ہی باخبری، منصوبہ بندی اور ہوش مندی کے ساتھ یہ کام کررہے تھے؛ چوں کہ عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان شدید اختلافات تھے اور وہ ایک دوسرے کی تکفیر کرتے تھے؛ اس لئے انھوں نے اتحاد کی

یہ شکل نکالی کہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں کو مختلف فرقوں کی تحویل میں دے دیا کہ وہ باہمی اختلافات سے بچتے ہوئے عیسائیت کی تبلیغ کریں اوران کے پس پشت حکومت کا بھر پورتعاون بھی ہواور نظام تعلیم کے ذریعہ بھی اس مہم کوقوت پہنچائی جائے ،انھوں نے ہندوؤں کے لئے الگ مبلغ مقرر کئے اور مسلمانوں کے لئے الگ مبلغ ،جن مبلغین کوجس قوم میں کام کرنا تھا،اس کے افکار ونظریات ، مذہبی احکام اور رسوم ورواج کے بارے میں ان کو بھر پور معلومات فراہم کی گئیں ، پھر جو ہندو یا مسلمان عیسائیت قبول کرتا ، اس کو اس حلقہ کے مبلغ کے ساتھ لگا دیا جاتا اور تربیت دی جاتی کہ وہ اپنے ہم مذہب لوگوں میں اس مذہب کی کمزوریاں بنابنا کر تقریر وتحریر کے ذریعہ پھیلائیں ، مسلمانوں میں جن اہل علم نے اپنے لئے دوزخ کا راستہ منتخب کیا اورعیسائیت قبول کی ، ان میں منشی صفدر علی اور پادری عمادالدین پیش پیش تھے،صفدرعلی جبل پور کا رہنے والا تھااور وہ ۱۸۶۵ء میں مرتد ہوا تھا،اس نے اسلام کے خلاف اورعیسائیت کی حمایت میں ’ نیاز نامہ‘ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ،جس کوخوب شہرت دی گئی ،عماد الدین امرتسر کا رہنے والا تھا، جو ۱۸۶۶ء میں مرتد ہوا، اس نے اسلام کے خلاف گستاخانہ لب ولہجہ میں بہت سی کتابیں لکھیں اور کلکتہ ولاہور میں پادری کے عہدہ پر فائز ہوا،عیسائی مشنری نے اسے ڈاکٹر آف ڈیوی ٹی یعنی ’’علامہ الٰہیات‘‘ کی ڈگری بھی دی ،عیسائی دنیا کے حوصلے کس قدر بڑھ گئے تھے،اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ سر چارلس ٹریویلین آئی،سی،ایس نے جو برطانوی کونسل کے ممبر تھے اور بعد میں گورنر بھی ہوگئے تھے،انھوں نے کہا :

> میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے، اسی طرح یہاں بھی سب کے سب ایک ساتھ عیسائی ہوجائیں گے، ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلا واسطہ پادریوں کے ذریعہ سے اور بالواسطہ کتابوں ، اخباروں اور یورپینوں کی بات چیت وغیرہ کے ذریعہ سے نفوذ کرے گی، حتی کہ عیسوی علوم تمام سوسائٹی میں اثر کر جائیں گے، تب ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ہوا کریں گے۔(۱)

عیسائی مشنری کی کوششوں اور پھر اس میں مرتدین کی شرکت کی وجہ سے فتنۂ ارتداد تیزی سے پھیلنے لگا ، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ —— جن کا کام ردعیسائیت پر بےنظیر ہے اورجنھوں نے اس موضوع پر ’’اظہارالحق‘‘ جیسی مؤثر کتاب تالیف کی ہے —— کے بعد سے ایک طرح سے ردعیسائیت کے میدان میں خلا سا پیدا ہوگیا تھا اور عیسائی مبلغین کو گویا کھلا میدان مل گیا تھا۔

اس وقت ایک خواب کی تعبیر کے طور پر مولانا کے دل میں عیسائیت کے فتنۂ ارتداد کا مقابلہ کرنے کا خیال

(۱) تاریخ التعلیم:۶۹۔

پیدا ہوا، اس کے لئے انھوں نے کانپور سے ۱۲۸۹ھ میں منشور محمدی کے نام سے ایک رسالہ نکالا، جو چار پانچ سال تک جاری رہا، کانپور کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ وہاں عیسائیوں کی نو عیسائی مشنریز کام کر رہی تھیں، اس رسالہ نے گہرے اثرات ڈالے، جدید تعلیم یافتہ مسلمان جو اس فتنہ سے متاثر ہو گئے تھے، ان میں بہتوں کا ذہن صاف ہوا اور لوگوں کو توبہ کی توفیق ہوئی، مرتد پادریوں کو بار بار دعوت دینے اور چیلنج کرنے کے باوجود جواب دینے کی ہمت نہیں ہوئی، عیسائیوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے ہمیشہ سے مالی امداد و تحریص کا راستہ اختیار کیا ہے؛ اس لئے تبلیغی مشن کے تحت وہ یتیم خانے بھی بنانے تھے، آپ نے کانپور میں یتیم خانہ اسلامیہ قائم فرمایا؛ تاکہ یتیم و معصوم بچوں کو مرتد کرنے کی سازش کا مقابلہ کیا جا سکے۔

پادری حضرات خاص طور پر قرآن مجید کو نشانہ بناتے تھے، وہ کہتے تھے کہ قرآن مجید کی ترتیب اور کتابت کا کام رسول اللہ ﷺ کے کافی بعد ہوا ہے، اس سلسلہ میں پادریوں کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر ان کی رد میں آپ نے 'البرہان لحفاظۃ القرآن' کے نام سے ایک کتاب لکھی، مگر افسوس کہ یہ رسالہ مطبع ہی میں تلف ہو گیا، مگر اس کا خلاصہ آپ نے اپنے مکاتیب میں ذکر فرمایا ہے، جو مکاتیب محمدیہ (حصہ اول) میں موجود ہے، آپ نے اس میں ثابت کیا ہے کہ پورا قرآن مجید موجودہ ترتیب کے ساتھ عہد نبوی میں لکھا جا چکا تھا، آپ کے بعد کئی صحابہؓ نے قرآن مجید کے نسخے لکھے، یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان تمام نسخوں کا مقارنہ کر کے اسے تحریر کرایا، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے رد عیسائیت میں اعجاز عیسوی لکھی تھی، پادری عماد الدین نے 'ہدایت المسلمین' کے نام سے ۱۸۶۸ء میں اس کا جواب لکھا، مولانا نے اس کا جواب 'مرأۃ الیقین' کے نام سے تالیف فرمایا اور ثابت کیا کہ خود عیسائی علماء انجیلوں میں تحریف کے معترف ہیں اور مولانا کیرانویؒ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ صد فیصد صحیح ہے۔

منشی صفدر علی نے اسلام کے رد میں ایک کتاب 'نیاز نامہ' لکھی تھی، جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتابوں کے بعد اب قرآن کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی، مولانا نے اس پر مدلل رد فرمایا اور اس رد کو 'آئینہ اسلام' کے نام سے شائع فرمایا، پادری عماد الدین کے مناظرانہ خطوط کا مجموعہ ایک عیسائی شخص نے نغمۂ طنبوری کے نام سے شائع کیا تھا، آپ نے 'ترانہ حجازی' کے نام سے اس کا جواب تحریر فرمایا، جس میں نبوت محمدی کے ثبوت، انبیاء کرام کی عصمت، قرآن مجید کے انجیل و تورات سے ماخوذ نہ ہونے وغیرہ مسائل پر مدلل گفتگو کی گئی ہے، اسی پادری نے ایک اور کتاب 'تعلیقات' کے نام سے لکھی تھی، آپ نے 'دفع التلبیسات' اس کے جواب میں لکھی، جس میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو ثابت کیا گیا ہے اور انجیل کے محرف ہونے پر تفصیل سے بات کی گئی ہے، اخبارات میں اعلانات کے باوجود کسی پادری کو اس کا جواب دینے کی ہمت نہیں ہوئی،

اس کے بعد قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے اور عیسائی عقائد کے باطل ہونے پر آپ نے ساطع البرہان اور براہین قاطعہ تصنیف فرمائی۔

ردعیسائیت میں آپ کی سب سے اہم کتاب پیغام محمدی (۳/جلدیں) ہے، جو صفدر علی کے 'نیاز نامہ' اور پادری ٹھاکر داس کی کتاب 'عدمِ ضرورت قرآن' کا جواب ہے، مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی تالیفات میں جو مقام 'اظہار الحق' کا ہے، وہی آپ کی تالیفات میں 'پیغام محمدی' کا ہے، مولانا کی ان کوششوں کا عیسائی مناظرین اور پادریوں پر ایسا اثر پڑا کہ وہ آپ کا سامنے ہی کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے اور نام سن کر ہی بھاگ کھڑے ہوتے تھے، آپ کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ بائبل اور عیسائیوں کے مذہبی لٹریچر پر مولانا کیرانویؒ ہی کی طرف آپ کی بھی عمیق اور وسیع نظر تھی۔

آپ کا احساس تھا کہ فتنۂ ارتداد کی طرف علماء کی جو توجہ ہونی چاہئے، وہ نہیں ہے، آپ نے متعدد خطوط میں اس کی طرف متوجہ فرمایا ہے اور اس پس منظر میں جدید علم کلام مرتب کرنے کی تلقین کی ہے، ایک موقع پر کس دل سوزی کے ساتھ فرماتے ہیں :

> کیا اس اہانت کی جواب دہی علماء کے ذمہ نہ ہوگی، بے شک ہوگی؛ کیوں کہ یہ انھیں کا کام تھا، انھوں نے کیوں ترک کیا اور کس لئے کمزوروں کی مدد نہ کی، اس وجہ سے ضرور ہے کہ علماء اس طرف توجہ فرمائیں اور جس طرح علوم پڑھایا کرتے ہیں، اسے بھی پڑھائیں، پہلے زمانہ کا جو علم کلام ہے، وہ اس وقت کارآمد نہیں، جن فرقوں کا رد اُس میں ہے، ان کا وجود دنیا میں ناپید ہے، پھر ان کے رد کے درپے ہونا اپنے بیش بہا وقت کو رائیگاں کرنا ہے، اِس وقت اس علم کلام کو پڑھنا پڑھانا چاہئے، جس کی ضرورت اس وقت ہے۔ (پیغام محمدی:۳۲۰)

● اسی طرح حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے رد قادیانیت پر جو کام کیا، وہ ہندوستان میں احیاءِ دین اور حفاظت اسلام کا روشن ترین باب ہے، پنجاب کے بعد فتنۂ قادیانیت کی یورش سب سے زیادہ جس علاقہ پر ہوئی، وہ بہار کا علاقہ تھا، جس کے چار اضلاع بُری طرح اس کا شکار ہو رہے تھے: مونگیر، بھاگلپور، پٹنہ، ہزاری باغ، مونگیر اور بھاگلپور کے بارے میں تو خطرہ ہو گیا تھا کہ شاید مسلمانوں کی یہ پوری آبادی قادیانیت کے دام میں پھنس جائے، بھاگلپور میں مولوی عبدالماجد پورینی ایک اچھے عالم اور کامیاب مدرس تھے اور منطق وفلسفہ پر بڑا عبور رکھتے تھے، شرح تہذیب پر ان کا حاشیہ بھی ہے، وہ قادیانی ہو گئے تھے اور قادیانیت کو پھیلانے میں بڑے جوش وجذبہ سے

کام لے رہے تھے، مونگیر میں مرزا صاحب کے سمدھی اور مرزا بشیر محمود کے خسر مولوی حکیم خلیل احمد موجود تھے، اللہ نے ان کو ذہانت اور بہترین تقریر و بیان کی صلاحیت سے نوازا تھا، وہ اپنی صلاحیت کو اِس باطل کی اشاعت میں لگائے ہوئے تھے، رفتہ رفتہ یہ فتنہ بہار سے گذر کر بنگال تک پہنچ چکا تھا، قادیانی لٹریچر کی کثرت اور پھیلاؤ کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں ان کا رسالہ چھبیس ہزار کی تعداد میں شائع ہوتا تھا، یہ صورت حال مولانا کو کس طرح تڑپاتی تھی، انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں، تمام توانائیاں اور ممکنہ اسباب وسائل کو اس فتنہ کے استیصال کے لئے وقف کر دیا اور تحفظ ختم نبوت کے اس مقدس جہاد میں اپنے تمام مریدوں کو شریک ہونے کا حکم دیا۔

ردقادیانیت کی یہ کوشش اس وقت اپنے اوجِ کمال پر پہنچ گئی، جب ۱۹۱۱ء میں خانقاہِ رحمانی میں احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے مناظرہ کی مجلس آراستہ کی گئی اور مرزا غلام احمد قادیانی کو مناظرہ کی دعوت دی گئی، انھوں نے اپنی طرف سے حکیم نور الدین، سرور شاہ اور روشن علی کو متعین کیا، یہ حضرات مرزا صاحب کی تحریر لے کر آئے کہ ان کی فتح میری فتح اور ان کی شکست میری شکست ہوگی، مسلمانوں کی طرف سے تقریباً چالیس نامی گرامی علماء جمع تھے، جن میں علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبدالوہاب بہاریؒ، مولانا ابراہیم سیالکوٹیؒ اور مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، آپ نے مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ کو اپنا نمائندہ بنایا، اِدھر مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ نے اسٹیج پر تقریر شروع کی اور اُدھر آپ خدا کے حضور سر بہ سجود ہوگئے، اللہ نے کچھ اس طرح حق کا بول بالا اور باطل کا منھ کالا کیا کہ مولانا کی پہلی ہی تقریر کے بعد قادیانی مناظرین نے اپنے لاجواب ہونے کا اعتراف کرلیا اور راہ فرار اختیار کی۔

قادیانی چوں کہ اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے زیادہ تر لٹریچر کا سہارا لیتے تھے؛ اس لئے آپ نے بیک وقت جلسوں، تقریروں اور کتابوں کے ذریعہ اس فتنہ کا مقابلہ شروع کیا، آپ اپنے مریدوں کو لکھتے کہ مولود شریف کے جلسے کراؤ اور اس میں مرزا کے حالات بیان کرو، آپ تاکید فرماتے تھے کہ قادیانیت کے خلاف اتنا لکھو، طبع کراؤ اور تقسیم کرو کہ ہر مسلمان جب صبح سو کر اُٹھے تو اپنے سرہانے ردقادیانیت کی کتاب پائے، آپ کے ایک رفیق دونوں پیروں سے مفلوج ہونے کے باوجود مسودات صاف کرتے تھے، آپ ان سے فرماتے کہ محنت سے کام کرو، تمہیں جہاد کا ثواب ملے گا، انھوں نے دریافت کیا: جہاد بالسیف کا ثواب ملے گا؟ آپ نے فرمایا: بے شک، اس فتنۂ قادیانیت کا ثواب جہاد بالسیف سے کم نہیں، اس فتنہ کے استیصال کا آپ پر اس قدر غلبہ تھا کہ تہجد کا وقت بھی اسی کام میں صرف کرنے لگے، سعید مختار نامی ایک شخص ضلع مونگیر کے ایک علاقہ میں قادیانی رسائل تقسیم کرتا تھا، آپ نے وہاں اپنے ایک ارادت مند کو خط لکھا: ''تم سے جہاں تک ہو سکے، اس گمراہ کا پیچھا کرو، جہاں جہاں وہ جائے، تم بھی جاؤ''۔(۱)

(۱) خطوط بنام مولانا عبدالرحیم صاحب: ۳۔

ردقادیانیت کے کام کے سلسلہ میں آپ نے اپنے مختلف مریدین کو جو خطوط لکھے ہیں، ان سے آپ کے اضطراب وبے قراری اور غیر معمولی فکرمندی کا اظہار ہوتا ہے، قادیانی تحریک نے حیدرآباد کو بھی اپنا ہدف بنایا تھا، جب شروع شروع میں مرزا صاحب نے ردعیسائیت کا ڈھونگ رچا تھا، اس وقت نظام حیدرآباد نے ان کی مالی مدد بھی کی تھی، بعد کو وہاں مرزا صاحب کے ایک مرید اور اُس حلقہ کے مشہور مصنف خواجہ کمال الدین نے بڑی چالبازی کے ساتھ قادیانیت کی تبلیغ شروع کردی تھی، آپ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فضلیت جنگ حضرت مولانا شاہ انوار اللہ فاروقیؒ — جو حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ، جامعہ نظامیہ حیدرآباد اور دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد کے بانی ومؤسس اور خود نظام حیدرآباد نواب میر عثمان علی کے استاذ و اتالیق تھے اور ختم نبوت پر جن کی گراں قدر تالیف بھی موجود ہے — کو خط لکھا اور توجہ دلائی کہ وہ اس فتنہ کو رکوائیں، آپ نے اپنے تفصیلی خط کا آغاز اس شعر سے کیا ہے :

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
وگر خاموش بہ نشینم گناہ است

ردقادیانیت میں آپ نے جو کتابیں لکھی، ان کی تعداد ایک سو سے بھی زیادہ ہے، جن میں چالیس کتابیں آپ کے نام سے شائع ہوئیں اور بقیہ ابواحمد رحمانی یا کسی اور نام سے، ان تالیفات میں چشمۂ ہدایت، چیلنج محمدیہ، معیار صداقت، معیار مسیح، حقیقت مسیح، تنزیل ربانی اور نامۂ حقانی وغیرہ شامل ہیں؛ لیکن ان میں دو کتابیں بڑی اہم ہیں، ایک: فیصلۂ آسمانی، جو تین حصوں میں ہے، یہ ردقادیانیت پر آپ کی پہلی کتاب ہے، اس کتاب میں نہایت مدلل، مضبوط، واضح اور عام فہم اُسلوب میں مرزا صاحب کی تردید کی گئی ہے اور تین بنیادی نکات کو مرکز بحث بنایا گیا ہے، اول یہ کہ مرزا کے دعویٰ نبوت سے انسانوں کو بلکہ مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا؟ دوسرے: حدیث میں مسیح ومہدی کی کیا علامتیں ذکر کی گئی ہیں اور کیا وہ مرزا پر منطبق ہوتی ہیں؟ تیسرے: مرزا صاحب کے نجی حالات اور اخلاقیات وعادات، کہ نبی تو کجا کیا ایسی صفات کے حامل کو ایک شریف انسان بھی کہا جاسکتا ہے؟ اسی ضمن میں مرزا صاحب کی منکوحۂ آسمانی کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، اور اعجاز احمدی اور قصیدہ احمدی جس کو مرزا صاحب اپنا کلامی معجزہ قرار دیتے تھے، کی بھی پول کھول گئی ہے اور اس میں زبان وبیان اور بلاغت کی غلطیوں کو واضح کیا گیا ہے، قادیانی حضرات آج تک اس کتاب کا جواب دینے کی جرأت نہیں کرپائے۔

آپ کی دوسری اہم کتاب 'شہادت آسمانی' ہے، ۱۳۱۲ھ کے رمضان المبارک میں ایک ساتھ چاند اور سورج کا گہن لگا تھا، مرزا صاحب نے دعویٰ کردیا کہ یہ ان کے امام مہدی ہونے کی دلیل ہے؛ کیوں کہ حدیث

میں آیا ہے کہ امام مہدی کے عہد میں دونوں گہن کا اجتماع ہوجائے گا، اس بات کو قادیانیوں نے بڑے زور وشور سے پھیلایا، آپ نے اسی کے جواب میں یہ کتاب تالیف فرمائی، جس میں ایک طرف مدلل طور پر یہ بات واضح کی کہ قادیانی جس روایت کا سہارا لے رہے ہیں، وہ بے اصل ہے، دوسرے: دونوں گہن کا اجتماع کوئی غیر طبعی واقعہ نہیں ہے، اس طرح کے واقعات کئی بار پیش آ چکے ہیں اور آئندہ بھی پیش آسکتے ہیں، آپ نے علم ہیئت کے ماہرین کے بیانات سے اپنی بات کو مدلل فرمایا۔

غرض کہ حضرت مونگیری کی زندگی کا سب سے امتیازی پہلو اسلام کا دِفاع، فتنۂ ارتداد کا مقابلہ اور ہر دور میں اسلام کے خلاف اُٹھنے والے باطل افکار کا ابطال ہے، مگر افسوس کہ موجودہ دور میں ہم لوگ مسلکی کشاکش، آپسی اختلافات کی شدت میں پڑ کر بیرونی محاذ سے غافل ہیں اور اعداءِ اسلام کی طرف ہماری توجہ نہیں۔

مدارس کی اصلاح

حضرت مولانا مونگیری کی دوسری فکر مدارس کی اصلاح اور علماء کو موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق تیار کرنا تھا؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> افسوس صد افسوس! کوئی گروہ طلبہ کا ایسا نکلتا ہے جو ملحدوں اور جدید فلسفیوں کے اعتراضات کو اسلام سے دفع کرے، جس کا زہریلا اثر بسبب شیوع بے دینی وآزادی کے عالمگیر ہوتا جاتا ہے، اس کا مٹانا ہمارے علماء کا فرض ہے جس طرح ہوسکے، غرض کہ نہ تو حالت تحصیل میں انھوں نے کسی علم دین اور بالخصوص اُن علوم مذکورہ میں مہارت و مشق پیدا کی، نہ اس کے بعد انھیں نوبت آئی، اب فرمائیے کہ دین کا کام کون کرے؟ زیادہ افسوس یہ ہے کہ زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے نہ تو کسی دینی امر کا انتظام کرسکتے ہیں، نہ اس میں رائے دے سکتے ہیں، (شاذونادر کا اعتبار نہیں)؛ حالاں کہ اِس وقت ایسے گروہ کی زیادہ ضرورت ہے۔

علماء کو موجودہ زمانہ کے معاملات سے واقف ہونا چاہئے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> ...... جو دقت میں نے فقہ میں بیان کی، وہ علمی حیثیت سے تھی، مگر ایک اور دقت اس میں ہمارے علماء کے لئے یہ ہے کہ زمانہ کے حالات پر ان کی نظر نہیں، دنیا کے معاملات سے اکثر ناواقف، ان کی پیچیدگیوں کا سلجھانا دشوار، جب فقہاء تصریح کرتے ہیں کہ زمانہ کے بدل جانے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں تو ضروری ہوا کہ

مفتی زمانہ کی حالت سے بھی واقف ہو اور اس طرح جب تک معاملات سے واقف نہ ہوگا اور اس کی پیچیدگیوں پر مطلع نہ ہوگا تو صحیح جواب کیوں کر دے گا؟

علماء کو کس طرح اپنے زمانہ کے احوال سے واقف ہونا چاہئے، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :

بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی دنیا کے حالات اور واقعات سے بھی باخبر ہو، اس کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ زندگی بسر کرتی ہے، اس کے اُصولِ سلطنت کیا ہیں، اس کو سلطنت سے کس قسم کا تعلق ہے، مسلمانوں کی دنیوی حالت کیا ہے، ان کو کیا ضرورتیں درپیش ہیں، سلطنت کے انتظامات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اُن سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ملک میں علماء کا جو اثر کم ہوتا جارہا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال عام طور پر پھیلتا جاتا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں اور اُن کو دنیا کے حال سے بالکل خبر نہیں ؛ اس لئے دنیاوی معاملات میں اُن کی ہدایت اور ان کا ارشاد بالکل ناقابل التفات ہے۔

آپ نے اُس زمانہ میں ندوہ کے نظام تعلیم اور نصابِ تعلیم کے سلسلہ میں جو تجاویز پیش کیں، ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور آپ کی روشن خیالی، بالغ نظری اور دور اندیشی کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً طلبہ کے لئے یونیفارم، گھوڑ سواری، نشانہ بازی اور تیراکی کی مشق، علمی و اخلاقی مضامین پر سمپوزیم، عربی زبان کی مشق، سیاسی و تاریخی موضوع پر مشق، جغرافیائی مضامین کی مشق وغیرہ، پھر آپ نے نصاب کا جو خاکہ پیش کیا ہے، اس میں درس نظامی میں شامل متداول مضامین کے علاوہ تاریخ، اُصولِ لغت، تجوید، عروض، سلوک وتہذیب نفس اور اسرار احکام کو بھی شامل کیا ہے ، مولانا کے ذہن میں ایک ایسے نئے علم کلام کا تصور تھا، جس میں موجودہ دور کے نئے فرقوں اور افکار کا جائزہ لیا جائے، انگریزی کو آپ علماء کے لئے بہت ضروری سمجھتے تھے؛ چنانچہ لکھتے ہیں: ''فلسفہ جدید کے رد کرنے کے لئے انگریزی زبان کا جاننا بھی ضروری ہے''۔

ایک اور موقعہ پر انگریزی زبان کے بارے میں فرماتے ہیں :

اب ذرا غور کیجئے کہ انگریزی بھی ایک زبان ہے، جس طرح فارسی و ترکی وغیرہ، جس طرح فارسی و ترکی اولاً کفار کی زبان تھی ، جب اس زبان والے اسلام لائے تو مسلمانوں میں وہ زبان شائع ہوئی، اسی طرح اگر خدا کا فضل ہو، جس کے ہونے کی اُمید کی جاتی ہے اور انگریزی زبان والے اسلام لائیں تو اُن کا حال بھی فارسی ترکی

زبان کا سا ہوجائے گا اور جس طرح آپ فارسی میں کتب دینیہ دیکھتے ہیں، انشاء اللہ انگریزی زبان میں بھی دیکھیں گے۔

آپ چاہتے تھے کہ طلبہ کو اُردو ادب بھی ایک مضمون کے طور پر پڑھایا جائے اور انھیں مضمون نویسی کی مشق کرائی جائے، قرآن مجید کی تعلیم میں قرآن کے اصل مضمون پر توجہ دی جائے نہ کہ مفسرین کے اقوال پر، قرآن کے سلسلہ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے آپ نے تجویز پیش کی تھی کہ قرآن مجید اور فقہ کے لئے خصوصی انعام رکھا جائے، غرض کہ مولانا نے ایک روشن خیال، زمانہ شناس مفکر کی طرح داعیانہ تڑپ کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کا خاکہ بنایا، وہ چاہتے تھے کہ اس کارگاہ سے ایسے فضلاء تیار ہوں، جو اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اپنے زمانہ کی زبان اور اس زبان کے مقبول اُسلوب میں اسلام کی حقانیت کو پیش کریں اور اسلام کی دعوت و اشاعت کا فریضہ انجام دیں۔

اتحادِ ملت

مولانا کی فکری زندگی کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ آپ چاہتے تھے کہ مسلمان آپسی اختلافات سے اوپر اُٹھ کر اسلام کی خدمت کریں، اُمت کا اختلاف زیادہ تر علماء کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے؛ اس لئے خاص کر اس بات پر زور دیتے تھے کہ علماء کے باہمی نزاعات کو ختم کیا جائے اور ان کے اختلافات مہذب دائرہ سے باہر نہ ہونے پائیں؛ چنانچہ قیام ندوۃ العلماء کے مقصد نمبر ۲ پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں :

> اس وقت ہمارے علماء کی باہمی نزاعیں سخت نقصان پہنچا رہی ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے امروں میں بڑا فساد برپا ہوتا ہے، جس سے علماء اسلام اور خود ہمارے پاک مذہب اسلام کی مخالفین کی نظروں میں اہانت ہوتی ہے، یہ انجمن کوشش کرے کہ یہ باہمی نزاع نہ ہونے پائے اور جب کوئی اختلاف گروہ میں واقع ہوا کرے تو وہ اس انجمن کے ذریعہ طے ہوجایا کرے۔(۱)

ندوۃ العلماء کی روداد سال اول میں علماء کی جماعتی عصبیتوں اور نزاعات کا حال دل سوزی کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> اب خیال کیجئے مقلدین وغیر مقلدین میں کیسی کیسی شرمناک لڑائیاں ہوتی ہیں، ایک

(۱) روئداد ندوۃ العلماء سال اول، حصہ اول: ۱۴۔

بھائی دوسرے بھائی کی جان کا ، مال کا ، آبرو کا کس طرح خواہاں ہوتا ہے ، خلافِ مذہب کے اجلاس میں مقدمات جاتے ہیں ، ہمارے محترم علماء مجرموں کی طرح سامنے کھڑے ہوتے ہیں، صحیح بخاری، صحیح مسلم، اور دیگر کتب حدیث اُن کے جوتوں کے پاس ان کے نیچے ڈھیر ہوتی ہیں اور آمین و رفع یدین کی تحقیق جناب چوبے گھنشیام داس صاحب بہادر اور کرمول صاحب بہادر کے روبرو پیش ہوتی ہیں اور اس کو دین خیال کیا جاتا ہے، افسوس صد افسوس! ایسے فہم وخیال پر، ہمارے علماء کا اس طرح اجلاس میں کھڑا ہونا کیا شانِ علماء کے خلاف نہیں ہے؟ کیا ہمارے دین کی کتابوں اور ہمارے ہادیِ برحق کے ارشادوں کا یوں بے حرمتی سے رکھا جانا دین کی ہتک نہیں ہے؟ مذہبی اختلافات کا جھگڑا مخالفین مذہب کے روبرو پیش کرنا سخت بے دینی نہیں ہے؟ (روداد سال اول حصہ اول: ۱۲-۱۶، باختصار)

غرض کہ آپ کی زندگی ورق ورق روشن کا مصداق ہے ؛ لیکن تین جہتیں آپ کو اپنے معاصرین کے درمیان ممتاز کرتی ہے، اسلام کا دفاع ، موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق علماء کی تیاری اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو ختم کرنا اور اس کے لئے خود علماء میں تحمل و رواداری کا مزاج پیدا کرنا، موجودہ حالات میں ان افکار کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے ، آج قادیانیت اور عیسائیت کے فتنے کے علاوہ ہندو رجعت پسندی ، الحاد ، مغربیت اور استشراق کا فتنہ سر کے اوپر سے گذر رہا ہے، مسلم سماج میں کوئی بھی فتنہ اُبھرتا ہے تو مغربی طاقتیں اس کو بھرپور تقویت پہنچاتی ہیں ، مدارس کے سلسلہ میں مولانا مونگیریؒ کو جو شکایت تھی ، وہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ آج بھی جوں کا توں باقی ہے اور علماء کے اختلافات اور اختلافات کے اظہار میں اخلاقی گراوٹ کی صورت حال آج بھی وہی ہے، جس کا آپ نے نقشہ کھینچا ہے؛ اس لئے یہ حقیقت ہے کہ حضرت مولانا مونگیریؒ کی فکر آج بھی اتنی ہی اہم ہے، جتنی اُس دور میں تھی ، کاش! اس حقیقت کی طرف توجہ کی جائے۔

● ● ●

علامہ سعد الدین تفتازانیؒ — حیات وخدمات

مولانا عبید اختر رحمانی ☆

تمہید

درس نظامی پر جن مصنفین نے سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے، ان میں سے ایک علامہ سعد الدین تفتازانیؒ ہیں، ان کی کتابیں صدیوں سے داخل درس رہی ہیں، بالخصوص منطق، فلسفہ، بلاغت، اُصول فقہ میں ان کی کتابوں کا پڑھنا عالم ہونے کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا، آج اسی شہرہ آفاق عالم کی یاد تازہ کرنے کے لئے یہ مختصر مقالہ لکھا جارہا ہے، اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اپنے محسنوں کو یاد کرنا مکارم اخلاق میں سے ہے۔

ولادت

آپ کی ولادت صفر کے مہینہ میں سنہ ۷۲۲ ہجری میں خراسان کے ایک مردم خیز شہر سرخس کے ایک گاؤں تفتازان میں ہوئی، اور آپ اسی گاؤں کی نسبت سے تفتازانی مشہور ہیں، (۱) بعض حضرات جن میں حافظ ابن حجرؒ اور علامہ زرکلیؒ وغیرہ ہیں، انھوں نے آپ کی تاریخ ولادت ۷۱۲ ہجری لکھا ہے۔ (۲)

نام ونسب اور لقب

آپ کا نام مسعود ہے، والد کا نام عمر ہے (آپ کے والد قاضی تھے اور ان کا لقب فخر الدین ہے) دادا کا نام عبداللہ ہے (عبداللہ کا لقب برہان الدین ہے) عموماً مؤرخین نے یہیں تک نقل کیا ہے۔

اساتذہ

ابتدائی تعلیم آپ نے کن سے حاصل کی، اس سے کتب تاریخ وسوانح خالی ہیں؛ لیکن چوں کہ آپ ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کے والد عالم اور قاضی تھے، لہٰذا قیاس یہی ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو

☆ نگراں شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۱) البدر الطالع للشوکانی: ۲/ ۳۰۳۔

(۲) دیکھئے الدرر الکامنہ: ۶/ ۱۱۲، الاعلام للزرکلی: ۷/ ۲۱۹۔

ابتدا سے ہی حصول علم میں مشغول کیا ہوگا، آپ نے اولاً قرآن کریم حفظ کیا، تجوید سیکھا اور پھر صرف ونحو اور بلاغت کی جانب توجہ کی اور جب اعلیٰ تعلیم کے قابل ہو گئے تو اپنے دور کے اکابر علماء سے، علم کلام، فلسفہ، تفسیر اور دیگر فنون کی تحصیل کی۔

اساتذہ ومشائخ

علامہ عضد الدین ایجی شافعیؒ (م:۷۵۶ھ)

آپ کے اساتذہ میں سب سے نامور اور جن سے آپ کو خصوصی نسبت رہی ہے اور جن سے آپ نے خصوصی استفادہ کیا ہے اور جن کا اپنی کتابوں میں مختلف حوالوں سے ذکر خیر کیا ہے، وہ علامہ عضد الدین ایجیؒ ہیں، آپ کا نام عبدالرحمٰن تھا، اور ایج کی نسبت سے ایجی سے مشہور ہوئے، آپ ماوراء النہر کے علاقہ میں شافعی مسلک سے تعلق رکھنے والے اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم تھے۔(۱)

قطب الدین تحتانی شافعیؒ (م:۷۶۶ھ)

علوم عقلیہ میں علامہ تفتازانی نے جن سے بطور خاص استفادہ کیا ہے وہ قطب الدین محمود یا محمد بن نظام شیرازی تحتانیؒ ہیں، علوم عقلیہ میں آپ کی مہارت اور رُسوخ مسلم تھا اور تمام مؤرخین نے اس کو خاص طور پر ذکر کیا ہے۔(۲)

بہاء الدین سمرقندی حنفیؒ

آپ کے تیسرے مشہور استاد بہاء الدین سمرقندی حنفی ہیں، فقہ کا علم آپ نے ان سے ہی حاصل کیا تھا، اس کی صراحت ابن تغری بردی نے کی ہے۔(۳)

---

(۱) آپ کے حالات کے لئے دیکھئے: "شذرات الذهب" (8/ 298) و"طبقات الشافعية الكبرى" (10/ 46) و"طبقات الشافعية" (2/ 238) و"النجوم الزاهرة" (10/ 288) و"الدرر الكامنة" (2/ 429) و"بغية الوعاة" (2/ 75) و"البدر الطالع" (326/1)۔

(۲) آپ کے حالات کے لئے دیکھئے: "الدرر الكامنة" (17/5) و"شذرات الذهب" (355/8) و"النجوم الزاهرة" (70/11) و"بغية الوعاة" (281/2) و"مفتاح السعادة" (275/1) و"الأعلام" (38/7) و"هدية العارفين" (163/2)۔

(۳) المنہل الصافی، بحوالہ التفتازانی وموقفہ من الالہیات: ۱/ ۱۹۹۔

ضیاء الدین قزوینیؒ (م:۷۸۰ھ)

آپ کے چوتھے استاد جن سے آپ نے علوم عقلیہ حاصل کیا ہے، وہ ضیاء الدین عبداللہ بن سعداللہ قزوینیؒ ہیں، آپ قاضیٔ قرم کے عرف سے مشہور ہیں، آپ بڑے محدث تھے، علوم نقلیہ بالخصوص حدیث کا علم علامہ سعدالدین تفتازانیؒ نے ان سے ہی حاصل کیا، آپ کے بارے میں یہ بات مؤرخین نے بڑی دلچسپ لکھی ہے کہ آپ کی ڈاڑھی بڑی طویل تھی، آپ کے قدموں تک آتی تھی، اور آپ جب سوتے تھے تو اس کو ایک جھولے میں ڈال کر سوتے تھے، اور جب کہیں جانے کے لئے سواری پر سوار ہوتے تو اس کو دو چوٹیوں میں تقسیم کر لیتے تھے، آپ بازار میں گھومتے تھے تو لوگ آپ کو دیکھ کر سبحان اللہ اور سبحان الخالق وغیرہ کہتے تھے، اس کو سن کر آپ کہتے تھے کہ یہ لوگ تقلیدی مومن نہیں؛ بلکہ تحقیقی مومن ہیں، مخلوق کو دیکھ کر خالق پر استدلال کرتے ہیں۔(۱)

طالب علمی کے عہد کا ایک واقعہ

مشہور مؤرخ مسعودی لکھتے ہیں :

> سعدالدین ابتدائے طلب علم میں نہایت کند ذہن تھے، اپنے استاد علامہ عضدالدین کی تقریر ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، علامہ عضدالدین ان کی کند ذہنی کی دوسرے طلبہ کو مثال دیا کرتے تھے؛ لیکن علم کے طلب اور حصول میں علامہ سعدالدین پوری محنت اور جدوجہد سے کام لیتے تھے، سبق سمجھ میں نہیں آتا تھا، لیکن اسے سمجھنے کی اور حل کرنے کی اپنی جانب سے پوری کوشش کرتے تھے اور کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے، ایک دن وہ تنہائی میں مطالعہ کر رہے تھے، ایک انجان شخص ان کے پاس آیا اور ان سے کہا: چلو ذرا گھوم پھر کر آتے ہیں، علامہ سعدالدین نے جواب دیا کہ مجھے باوجود کوشش اور محنت کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اگر گھومنے پھرنے میں وقت ضائع کروں گا تو میرا کیا حال ہوگا، وہ شخص دوبارہ آیا اور گھومنے پھرنے کی بات دوہرائی، علامہ سعدالدین نے پہلے والا ہی جواب دیا، وہ انجان شخص تیسری مرتبہ آیا اور گھومنے پھرنے کی بات کہی، اس پر علامہ سعدالدین نے کہا کہ تم تو مجھ سے

---

(۲) آپ کے حالات کے لئے دیکھئے: "المنهل الصافي" (404/7) و"الدليل الشافي" (436/1) وعنهما تكملة الاسم و"النجوم الزاهرة" (193/11) و"شذرات الذهب" (459/8)۔

بھی زیادہ کند ذہن ہو، میں تمھیں کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے گھومنے پھرنے سے کوئی رغبت نہیں، میں اس کے لئے پیدا نہیں ہوا، وہ شخص چوتھی مرتبہ آیا اور کہا کہ چلو! تمھیں رسول پاک ﷺ یاد فرمارہے ہیں، یہ سن کر آپ جلدی سے ننگے پاؤں اس آدمی کے ساتھ روانہ ہوگئے، جاکر دیکھا تو پایا کہ رسول پاک ﷺ کچھ درختوں کے سائے میں اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہیں اور متبسم ہیں اور فرمارہے ہیں کہ میں نے تمھیں کئی مرتبہ بلایا؛ لیکن تم نہیں آئے، آپ نے معذرت کی کہ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ آپ نے بلایا ہے اور اسی کے ساتھ اپنی کند ذہنی کی شکایت کی اور اس کے دفعیہ کی درخواست کی، آپ ﷺ نے منھ کھولنے کا حکم فرمایا اور اس میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا، جب اگلے دن علامہ سعد الدین درس میں حاضر ہوئے، تو ان کی شان ہی دوسری تھی، انھوں نے علامہ عضد الدین کی تقریر پر کچھ اعتراضات کئے، ساتھیوں نے حسب معمول اس کو مہمل جانا؛ لیکن علامہ عضد الدین پتہ پاگئے کہ آج کا سعد الدین کل کے سعد الدین سے الگ ہے، دنیا ہی بدل چکی ہے، زمین آسمان کی بلندی پاچکا ہے۔(۱)

یہ واقعہ شذرات الذہب میں بعض افاضل کے حوالہ سے ہے؛ لیکن اس واقعہ کی صحت پر بہت کچھ شبہات ہیں، زیادہ اعتراض اس بات پر ہے کہ اس کو دین داری کا واقعہ مانا گیا ہے، اگر اس کو خواب کا واقعہ مانا جائے تو کوئی اشکال یا اعتراض باقی نہیں رہ جاتا۔

شاگردان وتلامذہ

زندگی میں آپ کے دو ہی شوق تھے، تدریس اور تصنیف، اور علم کے فروغ کے یہی دو بنیادی ذریعے بھی ہیں، آپ کی علمی شہرت کے پیش نظر دُور دُور سے طلبہ آپ کے پاس آکر علم حاصل کرتے تھے، اور جب تدریس سے فرصت پاتے تو تصنیف وتالیف میں لگ جاتے تھے، لیکن چونکہ آپ مختلف وقتوں میں مختلف شہروں میں قیام پذیر رہے، ایک ہی جگہ مستقل رہ کر علم کی مسند آراستہ نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ تدریس کے ذریعہ جیسے آپ کا فیض عام ہونا چاہئے تھا، ویسا نہیں ہوسکا؛ لیکن اس کی پوری تلافی آپ نے اپنی گراں قدر اور بیش قیمت تصنیفات سے کردی، آپ کے شاگردوں میں سے چند کا یہاں ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے :

(۱) شذرات الذہب: ۸/۵۴۸۔

(۱) حسام الدین حسن بن علی بن حسن ابیوردی خطیبی (ولادت ۷۶۱، وفات ۸۱۶ھ)۔

(۲) حیدر بن احمد بن ابراہیم رومی حنفی معروف بہ شیخ التاج (ولادت ۷۸۰، وفات ۸۵۴ھ)۔

(۳) علاء الدین علی بن موسیٰ بن ابراہیم رومی حنفی (ولادت ۷۵۶، وفات ۸۴۱ھ)۔

(۴) محمد بن عطاء اللہ بن محمد رازی شافعی قاضی القضاۃ (ولادت ۷۶۷، وفات ۸۲۹ھ)۔

(۵) شمس الدین محمد بن فضل اللہ بن مجد الدین کریمی (ولادت ۷۷۳، وفات ۸۶۱ھ)۔

(۶) علاء الدین محمد بن محمد بن محمد بخاری حنفی (ولادت ۷۷۰، وفات ۸۴۱ھ)۔

(۷) فتح اللہ بن عبداللہ شروانی رومی حنفی (وفات ۸۵۷ھ)۔

(۸) جمال الدین یوسف بن رکن الدین خراسانی سمرقندی۔(۱)

علامہ سعد الدین تفتازانی کے تمام تلامذہ میں صرف آخر الذکر کو ہی امتیاز حاصل ہے کہ علامہ تفتازانی نے ان کو اجازت دی تھی کہ میری کتابوں میں اگر کچھ غلطی پاؤ تو اس کی اصلاح کر دو۔(۲)

اسفار

علامہ نے مختلف شہروں میں مختلف عرصہ تک قیام کیا ہے، ان کے مختلف شہروں میں ٹھہرنے کا سب سے بھروسہ مند ذریعہ ان کی تالیفات پر تکمیل کی تاریخ اور جس شہر میں یہ جو تصنیف مکمل ہوئی، اس کا ذکر ہے، اور وہ تحریر ہے جو علامہ کے قبر پر بطور کتبہ لکھا ہے اور جس کو علامہ کفوی نے اعلام الاخبار میں نقل کیا ہے۔

آپ سنہ ۷۳۸ھ میں ترمذ میں تھے، اور یہیں آپ نے علم صرف میں شرح زنجانی کی تصنیف کی، پھر شرح تلخیص المفتاح آپ نے سنہ ۷۴۸ھ میں ہرات میں مکمل ہوئی، یہ تکمیل کی تاریخ ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اس سے عرصہ قبل ہرات آچکے تھے اور یہاں سے آپ غجدوان گئے اور وہاں آپ نے سنہ ۷۵۶ھ میں شرح تلخیص المفتاح کا اختصار کیا، یہاں سے آپ مزار جام گئے اور وہاں سنہ ۷۵۷ھ میں شرح رسالہ شمسیہ کی تالیف مکمل کی، یہاں سے آپ گلستان نامی شہر میں قیام پذیر ہوئے جو ترکستان میں واقع ہے اور یہیں آپ نے صدر الشریعہ کی توضیح کی مشہور عالم شرح تلویح کی تصنیف سنہ ۷۵۸ھ میں کی، پھر آپ خوارزم چلے گئے اور وہاں کے سلطان شاہ شجاع الدین کے علم پروری کے زیر سایہ ایک طویل مدت تک قیام کیا، اور اس قیام کے دوران وہاں سنہ ۷۶۸ھ میں شرح عقائد نسفیہ، سنہ ۷۷۰ھ میں اُصول فقہ میں شرح مختصر ابن حاجب، سنہ ۷۷۴ھ میں رسالہ ارشاد کی تصنیف کی،

(۱) بحواله التفتازانی وموقفه من الالهیات۔

(۲) مفتاح السعادۃ: ۱/ ۱۷۷۔

آپ خوارزم میں ہی قیام پذیر تھے کہ تیمور لنگ کی فوج نے خوارزم پر چڑھائی کردی اور خوارزم فتح کرلیا، آپ کے علمی کمال کا دُور دُور تک شہرہ تھا تو سرخس کے والی نے گزارش کی کہ امیر تیمور سے اجازت لے کر آپ کو سرخس بھیج دیا جائے؛ چنانچہ امیر تیمور کی اجازت ملنے کے بعد آپ کو سرخس روانہ کردیا گیا، سرخس میں سنہ ۷۸۲ ہجری میں 'مفتاح الفقہ' کی تالیف شروع کی، پھر آپ کے علم وفضل کا شہرہ سنتے ہوئے تیمور لنگ نے آپ کو سمرقند طلب کیا، تیمور لنگ جیسے ظالم وجابر کی ہم نشینی آپ کو پسند نہیں تھی؛ لہٰذا آپ نے سفرِ حج کے ارادہ کا عذر کرکے معذرت کی؛ لیکن یہ معذرت قبول نہ ہوئی اور دوبارہ سمرقند آنے کا فرمان صادر ہوا، مجبوری میں آپ نے سمرقند کے لئے رختِ سفر باندھا، اور سمرقند میں سنہ ۷۸۴ھ میں مقاصد الکلام اور اس کی شرح کی تصنیف کی، آپ پھر سرخس تھوڑی مدت کے لئے آئے اور یہاں آکر سنہ ۷۸۶ھ میں تلخیص الجامع کی تصنیف کی ابتدا کی، پھر سمرقند سے تھوڑے عرصہ کے لئے ہرات تشریف لے گئے اور ہرات میں ہی سنہ ۷۸۹ھ میں فتاوی حنفیہ کی تصنیف شروع کی، پھر آپ سمرقند تشریف لے آئے اور سمرقند میں ہی کشاف کی شرح لکھنی شروع کی اور اسی کی شرح لکھتے لکھتے جوارِ رحمت میں منتقل ہو گئے:

ولد علیه الرحمة والرضوان فی صفر سنة اثنی وعشرین وسبعمائة، وفرغ من تالیف شرح الزنجانی فی التصریف حین بلغ ستة عشر فی شعبان سنة ثمان وثلاثین وسبعمائة بترمذ، ومن شرح تلخیص المفتاح فی صفر سنة ثمان واربعین بهرات ومن اختصاره سنة ست وخمسین بغجدوان ومن شرح الرسالة الشمسیة فی جمادی الآخرة سنة سبع وخمسین وسبعمائة بمزارجام ومن شرح التوضیح فی ذی العقدة سنة ثمان وخمسین بکلستان ترکستان ومن شرح العقائد فی شعبان سنة ثمان وستین ومن حاشیة شرح المختصر فی الاصول فی ذی الحجة سنه سبعین ومن رسالة الارشاد سنة اربع وسبعین کلها بخوارزم ومن مقاصد الکلام وشرحه فی ذی القعدة سنة اربع وثمانین بسمرقند ومن تهذیب الکلام فی رجب، ومن شرح القسم الثانی من مفتاح العلوم فی شوال سنة تسع وثمانین بظاهر سمرقند وشرع فی تالیف فتاویٰ الحنفیة

يوم الاحد التاسع من ذی القعدة سنة تسع وثمانين بهرات وفی تاليف مفتاح الفقه سنة اثنی وثمانين ومن تاليف تلخيص الجامع سنة ست وثمانين كليهما بسرخس ، ومن شرح الكشاف فی الثامن من ربيع الاول سنة تسع وثمانين بظاهر سمرقند ، وتوفی يوم الاثنين الثانی والعشرين من محرم سنة اثنين وتسعين وسبعمائة بسمرقند ونقل الی سرخس ودفن بها يوم الاربع التاسع من جمادی الاولی من تلک السنة الی هنا مما كتب حول الصندوق ۔ (۱)

علمی مقام ومرتبہ

تقریباً تمام مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے آپ کے بلند پایہ محقق ،فلسفی ،علوم عربیہ دینیہ میں مہارت اوررسوخ کا ذکرکیا ہے اور بڑے وقیع لفظوں میں آپ کی مدح وتوصیف کی ہے، ذیل میں چندعلماء کے تاثرات نقل کئے جاتے ہیں، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :

وَكَانَ قد انْتَهَت إِلَيْهِ معرفَة عُلُوم البلاغة والمعقول بالمشرق بل بِسَائِر الْامْصَار لم يكن لَهُ نَظِير فِي معرفَة هَذِه الْعُلُوم ۔ (۲)

حافظ سیوطیؒ فرماتے ہیں :

الإِمَام الْعَلامَة عَالم بالنحو والتصريف والمعاني وَالْبَيَان والأصلين والمنطق وَغَيرهَا ۔ (۳)

ابن غزیؒ فرماتے ہیں :

الإمام العالم العلامة المحقق المدقق البليغ ۔ (۴)

علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں :

وفَاق فِي النَّحْو وَالصرْف والمنطق والمعاني وَالْبَيَان وَالْأُصُول وَالتَّفْسِير وَالْكَلَام وَكثير من الْعُلُوم وطار صيته واشتهر ذكره ۔ (۵)

(۱) اعلام الاخیار من فقہاء مذہب النعمان المختار، المولف: محمود بن سلیمان الکفوی، من مکتبۃ الاستاذ الدکتور محمد بن ترکی:326۔

(۲) الدرر الكامنة في أعيان المائة الثامنة :112/6۔ (۳) بغية الوعاة :2/ 285۔

(۴) ديوان الإسلام:3/ 24۔ (۵) البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع:2/ 303۔

علامہ کفویؒ لکھتے ہیں :

له آثار جليلة في أصول الحنفية وكان من محاسن الزمان لم تر العيون مثله في الأعلام وهو الأستاذ على الإطلاق والمشار إليه بالاتفاق۔ (۱)

ملاعلی قاری لکھتے ہیں :

عمر بن مسعود سعد الدين التفتازاني له التآليف الدالة على مزيد فطنته وذكائه ومزيد فهمه وارتفاعه۔ (۲)

علمی فتوحات

دنیا میں بہت سارے لوگ کتابیں لکھتے ہیں، لیکن قبولیت چند ہی مصنفین کو ملتی ہے اور ایسی مقبولیت کہ وہ کتابیں داخل درس ہوجائیں اور علماء اس کے پڑھنے پڑھانے، شرح وحاشیہ، تلخیص وتہذیب میں صدیوں لگے رہیں، چند ہی مصنفین کو ملی ہے، علامہ تفتازانی اس حوالے سے بڑے نصیب والے ہیں کہ ان کی متعدد تصانیف نے قبول عام حاصل کیا ہے اور صدیوں علماء نے مختلف جہات سے ان کی تصانیف کی خدمت کی ہے، تیمور جس نے دنیا کو روند ڈالا، اس نے بھی اس کا اعتراف کیا کہ میری تلوار سے پہلے علامہ تفتازانی کی کتابوں نے شہروں اور ملکوں کو علمی طور پر فتح کرلیا ہے، علامہ کورانی بڑے عالم اور باوقار بزرگ گزرے ہیں، سلطان فاتح کے ساتھ ان کی صحبت رہی ہے، سلطان ان کی بڑی عزت کرتا تھا، ایک مجلس میں علامہ کورانی نے سلطان محمد فاتح سے یہ واقعہ بیان کیا :

تیمور لنگ نے کسی کام سے اپنے ایلچی کو روانہ کیا اور اس کو تاکید کی کہ راستے میں جہاں تازہ دم گھوڑے ملے، لے لو، اتفاق کی بات کہ ایلچی جس سمت جارہا تھا، وہیں کہیں پر علامہ تفتازانی بھی خیمہ زن تھے، اس نے آپ کے تازہ دم گھوڑے زبردستی لینے چاہے، علامہ نے اپنے نوکروں سے اس ایلچی کو پٹوادیا، جب ایلچی نے اس کی شکایت تیمور لنگ سے کی تو تیمور لنگ نے کہا: ''اگر میرے بیٹے شاہ رخ نے یہ حرکت کی ہوتی تو میں اسے قتل کرادیتا؛ لیکن یہ ایسے شخص نے کیا ہے جس کی علمی فتوحات میری عسکری فتوحات سے زیادہ ہے، میں نے جس ملک کو بھی فتح کیا، میں نے پایا کہ وہاں ان کی تصنیفات میری عسکری فتح سے پہلے ہی پہنچ چکی ہے۔(۳)

(۱) الفوائدالبهية في تراجم الحنفية :135۔ (۲) الفوائدالبهية في تراجم الحنفية :135۔

(۳) الطبقات السنیہ:۱/ ۸۲۔

تصنیفات

علامہ تفتازانی ان اکابر علماء امت میں سے ہیں، جن کو اللہ نے تصنیفی ذوق سے نوازا تھا اور اس عطاء ربانی سے انھوں نے بھرپور کام بھی لیا، چنانچہ آپ کی بیشتر علوم وفنون میں تصنیفات ہیں اور ہر تصنیف اپنی جگہ گراں قدر ہے، آپ نے سولہ سال کی عمر سے قلم سنبھالا اور زندگی کی آخری سانس تک علم کی دولت کو عام کرتے رہے اور بیش قیمت معارف ونکات لٹاتے رہے، آپ کی تصنیفات کئی خانوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

صرف ونحو

شرح التصریف للزنجانی: یہ علامہ عزالدین عبدالوہاب بن ابراہیم زنجانی (م:۶۵۵ھ) کی علم صرف پر تصنیف ہے، آپ نے اس کی شرح لکھی ہے، اس کی شرح لکھتے وقت آپ کی عمر محض ۱۶ر سال تھی، سنہ ۷۳۸ھ میں یہ کتاب مکمل ہوئی، اس شرح کو سعدیہ بھی کہا جاتا ہے، علامہ تفتازانی کی اس شرح پر متعدد اجلہ علماء نے حاشیے لکھے ہیں، جیسے حافظ سیوطی، حافظ قاسم بن قطلو بغا، ابن ہلال نحو ودیگر۔

ارشاد الھادی: یہ کتاب نحو میں ہے، علامہ تفتازانی نے یہ کتاب اپنے بیٹے کے لئے لکھی تھی، یہ کتاب سنہ ۷۷۴ میں مکمل ہوئی۔ اس کا ذکر حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا ہے۔

شرح العوامل المأئة : العوامل المأئة : شیخ عبدالقاہر جرجانی (م:۴۷۱ھ) کی مشہور تصنیف ہے، اس کی شرح علامہ سعدالدین تفتازانی نے لکھی ہے، یہ ایک مختصر رسالہ ہے اور مکتبہ حرم مکی میں اس کا نسخہ موجود ہے، قوانین الصرف: اس کا ذکر بغدادی نے ہدیۃ العارفین میں کیا ہے۔

معانی وبیان

الشرح المطول علی تلخیص المفتاح: امام سراج الدین ابویعقوب یوسف بن ابوبکر بن محمد بن علی السکاکی (م:۶۲۶ھ) کی ایک تصنیف مفتاح العلوم کے نام سے ہے، اس کتاب کا تیسرا باب علم معانی اور بیان سے متعلق ہے، اس تیسرے باب کا اختصار یا تلخیص جلال الدین محمد بن عبدالرحمٰن بن عمر قزوینی شافعی (م:۷۳۹ھ) نے کی، اسی تلخیص کی آپ نے شرح لکھی ہے جو مطول کے نام سے درس کے حلقوں میں مشہور ہوئی، یہ کتاب ہرات میں سنہ ۷۴۸ھ میں مکمل ہوئی، آپ نے خود اس کتاب کی ابتدا اور انتہا کے بارے میں لکھا ہے کہ اس تصنیف کی ابتدا خوارزم میں دو رمضان ۷۴۲ھ میں ہوئی، اور تکمیل بروز بدھ، گیارہ صفر ۷۴۸ھ میں ہرات میں ہوئی، جب آپ نے اس کتاب کی تصنیف شروع کی، اس وقت آپ کی عمر محض بیس سال تھی، اس کتاب کو حلقہ درس میں

بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور صدیوں تک یہ کتاب علماء اور طلبہ کے زیر درس رہی اور بہت سارے علماء نے اس پر حواشی لکھے۔

الشرح المختصر علی تلخیص المفتاح: یہ کتاب علمی حلقوں میں مختصر معانی کے نام سے مشہور ہے، اور یہ دراصل مطول کا اختصار ہے، اس کی وضاحت علامہ تفتازانی نے خود کتاب کے دیباچہ میں کیا ہے، یہ کتاب ۷۶۵ھ کو غجدوان میں مکمل ہوئی، اس کتاب کو بھی علمی حلقوں میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی اور بہت سارے علماء نے اس پر حواشی اور تعلیقات لکھے۔

شرح القسم الثالث من مفتاح العلوم: علامہ تفتازانی نے اس کتاب میں علامہ سکاکی کی مفتاح العلوم کے تیسرے باب کی براہ راست شرح لکھی، یہ ان کی آخر عمر کی تصنیفات میں سے ایک ہے، یہ کتاب سمرقند میں سنہ ۷۸۹ء میں مکمل ہوئی، اس کتاب کو اگرچہ ماقبل کی صدیوں میں علماء نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس پر حواشی اور تعلقیات چڑھائے؛ لیکن تاحال یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی ہے، اس کتاب کے نسخے دنیا کے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں۔

اُصولِ فقہ

التلویح الی کشف حقائق التقیم: صدر الشریعہ عبداللہ بن مسعود محبوبی نے اُصول فقہ میں ایک کتاب لکھی، جس کا نام تنقیح رکھا، پھر اس کی خود ہی ایک شرح لکھی جس کا نام توضیح ہے، اسی متن اور شرح پر ایک فاضلانہ حاشیہ یا شرح علامہ تفتازانی نے لکھا جو تلویح کے نام سے مشہور ہے، علامہ تفتازانی نے یہ جب شرح یا حاشیہ لکھا تھا، تو اس وقت ان کی عمر محض ۳۶ سال تھی، اور اس علمی کم سنی میں انہوں نے جو حاشیہ لکھا ہے، اس نے ہر دور میں اکابر علماء سے خراج تحسین حاصل کیا ہے اور صدیوں تک یہ کتاب داخل نصاب رہی اور اجلہ علماء نے اس کی مختلف جہتوں سے خدمت کی، اسی شرح کے بارے میں فخر متاخرین مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھتے ہیں :

> وقد نطق هذا الكتاب بفضله ، وشهد بعلمه ، وكيف لاوكان استاذ العلماء المتاخرين وسيد الفضلاء المدققين ۔ (۱)

شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ تلویح کے بارے میں فرماتے ہیں :

> مع أن حاشية الامام السعد التفتازانی ''التلويح'' من خير من كتب على التوضيح ، وفی غاية من الانصاف والتحقيق دون

(۱) فرحة المدرسين، بحواله التفتازانی وموقفه من الالهيات: ۱/ ۲۵۴۔

تعصب أو تمحل مذهبي ، بل لو قيل : لولا ها لما كان لكتاب "التوضيح" المكانة العلمية التي يحتلها لكان ذلك صحيحاً۔(۱)

اس کتاب کی تکمیل ترکمانستان کے مشہور شہر گلستان میں ہوئی، علامہ تفتازانی خود اس کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی تکمیل بروز پیر، ۲۹/ذی قعدہ سنہ ۷۵۸ھ میں ہوئی، اس سے مولانا فرنگی محلی کی وہ بات غلط ثابت ہوتی ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی تکمیل سنہ ۷۶۸ھ میں ہوئی ہے۔

حاشية على شرح عضد الدين الايجي على مختصر المنتهي لابن الحاجب: مشہور مالکی فقیہ جمال الدین ابوعمرو عثمان بن عمر المعروف بہ ابن حاجب (م:۶۴۶ھ) نے اُصول فقہ میں ایک کتاب منتھی السول والامل فی علمی الاصول والجدل نام کی ایک کتاب لکھی، پھر خود ہی اس کتاب کا اختصار کیا اور اس کا نام مختصر یا مختصر المنتھی رکھا، اور یہ مختصر اصل کتاب سے زیادہ مقبول ومعروف ہوئی، بہت سے لوگوں نے اس مختصر پر شروحات لکھے، جن میں سب سے زیادہ مقبولیت علامہ عضد الدین ایجی کی شرح کو ملی، پھر اس شرح پر بہت سے علماء نے حاشیے لکھے، ان میں سے ایک حاشیہ علامہ ایجی کے شاگرد علامہ تفتازانی کا بھی ہے اور یہ حاشیہ بھی نکات ومعارف میں شرح کے ہی ہم پلہ ہے، اس کتاب کی تکمیل خوارزم میں ذی الحجہ کے مہینہ میں سنہ ۷۷۰ھ میں ہوئی ہے، دائرۃ المعارف الاسلامیہ نے اس کے مخطوطات کی نشاندہی کی ہے۔

فقہ

فتاویٰ الحنفية: یہ ہرات میں قیام کے دوران سے پوچھے گئے مسائل کے جوابات پر مشتمل مجموعہ ہے، اس کی ابتدا بروز اتوار، ماہ ذی قعدہ سنہ ۷۶۹ھ سے ہوئی ہے۔

مختصر شرح تلخيص الجامع الكبير: امام محمد بن الحسن الشیبانی کی وجہ سے مشہور عالم کتاب الجامع الکبیر ہے، جس کی بہت سے علماء اور فقہاء نے مختلف جہتوں سے خدمت کی ہے، کسی نے شرح لکھی، کسی نے خلاصہ کیا، کسی نے حاشیہ چڑھایا، وغیر ذلک، جن حضرات نے جامع کبیر کی تلخیص کی ہے، ان میں سے ایک مشہور حنفی فقیہ کمال الدین محمد بن عباد بن ملک خلاطی ہیں، ان کی تلخیص کی متعدد فقہاء نے شرح لکھی ہے، ان شروحات میں سے ایک امام مسعود بن محمد غجدوانی کی شرح ہے، علامہ سعد الدین تفتازانی نے اسی شرح کا اختصار اور تلخیص کرنا شروع کیا اور اس کا نام "مختصر شرح تلخیص الجامع الکبیر" رکھا، منقول ہے کہ جب امام غجدوانی تک لوگوں نے یہ خبر پہنچائی کہ علامہ تفتازانی نے آپ کی شرح کا خلاصہ کرنا شروع کر دیا ہے اور ان کی تصنیفات کی مقبولیت کے پیش نظر اندیشہ ہے کہ

---

(۱) اقامۃ الحجۃ، ص:۱۷۔

آپ کی یہ شرح گمنامی کی نذر ہوجائے گی، تواس پر امام غجدوانی نے فرمایا کہ ان کی یہ تصنیف مکمل نہیں ہوگی؛ چنانچہ اس تصنیف کی تکمیل سے پہلے ہی ان کا انتقال ہوگیا۔(۱)

شرح دیباجۃ الھدایۃ: ملاعلی قاری نے علماء احناف پر اپنی تصنیف میں علامہ تفتازانی کے ترجمہ میں ان کی تصنیفات کے ذیل میں اس کتاب کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ علامہ مرغینانی کی ہدایہ کے خطبہ کی شرح لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے؛ لیکن اسے مکمل نہ کرسکے، اس پر التفتازانی وموقفہ من الالھیات کے مصنف عبداللہ علی حسین الملا لکھتے ہیں: انھوں نے کشف الظنون جیسے ماخذ میں اس تعلق سے بہت تلاش کیا؛ لیکن ان کو علامہ تفتازانی کے ہدایہ کے خطبہ کی شرح کی تصنیف کے تعلق سے کچھ نہیں ملا، ہاں علامہ تفتازانی کے پڑپوتے علامہ سیف الدین احمد (م:۹۱۶ھ) کے تعلق سے یہ وضاحت ملتی ہے، ممکن ہے کہ غلطی سے علامہ تفتازانی کے پڑپوتے کی تصنیف ان کی جانب منسوب ہوگئی ہو۔

شرح فرائض السجاوندی: یہ کتاب مشہور حنفی فقیہ سراج الدین محمد بن محمد بن عبدالرشید سجاوندی (م:۶۰۰ھ) کی ہے، اس کتاب کی بہت ساری شرحیں لکھی گئی ہیں، جن میں سے ایک علامہ تفتازانی کی ہے، اس کا ذکر صاحب کشف الظنون اور ہدیۃ العارفین کے مولف دونوں نے کیا ہے۔

کلامیات

شرح العقائد النسفیۃ: عقائد نسفیہ نام کی کتاب مشہور حنفی فقیہ اور متکلم امام ابوحفص نجم الدین عمر بن محمد بن احمد نسفی سمرقندی (م:۵۳۷ھ) کی ہے، اس کی شرح متعدد علماء نے لکھی ہے، لیکن ان تمام شروحات میں سب سے زیادہ قبول عام علامہ تفتازانی کی شرح ہی کو نصیب ہوا، یہ تصنیف خوارزم میں شعبان سنہ ۷۶۸ھ کو پایہ تکمیل کو پہنچی۔

المقاصد: یہ علم کلام میں علامہ تفتازانی نے بطور متن لکھا ہے، اس میں علم کلام پر چھ مقاصد کے تحت کلام کیا ہے، پہلا: مبادی، دوسرا: امور عامہ، تیسرا: اعراض، چوتھا: جواہر، پانچواں: الٰہیات، چھٹا: سمعیات۔

شرح المقاصد: علم کلام میں مقاصد نامی کتاب جو بطور متن علامہ تفتازانی نے لکھی تھی، اسی کی شرح ہے، علامہ تفتازانی نے متن اور شرح ساتھ ساتھ لکھنا شروع کیا، طریقہ کار یہ تھا کہ پہلے مقاصد کے کسی کلامی مسئلہ کو مکمل کرتے، پھر اس کی شرح لکھتے، اس طرح دونوں کتابیں ایک ساتھ مکمل ہوئیں اور تمام تاریخی مصادر اس بات پر متفق ہیں کہ شرح مقاصد کی تکمیل سمرقند میں ذی قعدہ کے مہینہ اور ۷۸۴ھ میں ہوئی، اس کتاب کو علماء اور متکلمین کے حلقہ میں زبردست قبول عام حاصل ہوا اور علمی حلقوں میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

(۱) کشف الظنون: ۱/ ۳۷۴۔

منطق

شرح الرسالۃ الشمسیۃ: اس کوشمسیہ اورسعدیہ دونوں نام سے جانا جاتا ہے، اس کتاب کے مولف نجم الدین علی بن عمر بن علی شیعی (م:۶۷۵ھ ہیں) اپنے ممدوح خوعاجہ شمس الدین محمد جوینی کی وجہ سے اس کا نسم شمسیہ رکھا، اس کتاب کی متعدد علماء نے شرحیں لکھی ہیں، جن میں سے ایک علامہ تفتازانی کی بھی شرح ہے، یہ کتاب شہر جام میں جمادی الآخر میں مکمل ہوئی، لیکن تکمیل کے سنہ کے بارے میں بہت اختلاف ہے، کسی نے سنہ ۷۵۲ھ لکھا ہے تو کسی نے ۷۵۳ھ اور کسی نے ۷۵۷ھ اور کسی نے ۷۷۲ھ لکھا ہے۔

تھذیب المنطق والکلام: اس کے اور بھی نام بعض علماء نے ذکر کئے ہیں، یہ کتاب دو جز پر مشتمل ہے، اولاً علم منطق اور ثانیاً علم کلام میں، علم کلام کا جو حصہ ہے، وہ مقاصد کا اختصار ہے، یہ کتاب سمرقند میں رجب کے مہینہ میں ۷۸۹ھ میں مکمل ہوئی، اگرچہ یہ کتاب منطق اور علم کلام دونوں کو شامل ہے؛ لیکن منطق والے جز کو زیادہ قبول عام حاصل ہوا، اس کے بالمقابل علم کلام والا حصہ نسبتاً گمنام ہی رہا۔

تفسیر قرآن

حاشیہ علی الکشاف للزمخشری: یہ علامہ تفتازانی کی آخری کتابوں میں سے اور شاید سب سے آخری کتاب ہے اور اسی کی تالیف کے دوران ان کا انتقال ہوگیا، اور یہ کتاب مکمل نہیں ہوسکی، پہلا حصہ ابتدا سے سورہ یونس تک ہے اور دوسرا حصہ سورہ ص سے لے کر سورہ فتح تک ہے، تقریباً تمام تاریخی مصادر اس بات پر متفق ہیں کہ آپ نے سمرقند میں ۷۸۹ھ میں اس تصنیف کی ابتدا کی تھی، صاحب کشف الظنون اس بارے میں لکھتے ہیں کہ علامہ زمخشری کی یہ تصنیف علامہ شرف الدین طیبی (م:۷۴۳ھ) کے تفسیر کشاف پر حاشیہ سے ماخوذ ہے، اس کے بعد صاحب کشف الظنون نے علامہ تفتازانی کے حاشیہ کی بڑی تعریف کی ہے اور کشاف کے تمام حواشی میں اس کو سب سے بہتر، اور معارف ونکات میں سے سب عمدہ قرار دیا ہے، یہ کتاب تا حال طبع نہیں ہوئی ہے۔

لسانیات

دیوان سعدی: شیخ سعدی کے بوستاں کا آپ نے فارسی سے ترکی زبان میں ترجمہ کیا ہے، یہ کتاب ۷۵۵ھ میں مکمل ہوئی۔

النعم السوابغ فی شرح الکلم النوابغ: یہ علامہ زمخشری کی مشہور تصنیف الکلم النوابغ کی شرح ہے، جو فقہ اللغۃ جس کو آج کل لسانیات سے تعبیر کیا جاتا ہے، کے بارے میں ہے، یہ کتاب متعدد مرتبہ طبع ہو چکی ہے۔

متفرقات

رسالۃ الحدود: شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کوترکی کے ایک کتب خانے میں اس کا پتہ چلا تو انھوں نے اس کو تحقیق کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے مجلہ الشریعہ میں شائع کرایا، یہ چھوٹا سا تقریبا دس ورق کے قریب کا رسالہ ہے، جس میں مختلف حقائق اور ماہیات کی تعریف بیان کی گئی ہے۔

رسالۃ الاکراہ: اس کا بھی ذکر بعض حاجی خلیفہ اور بغداد نے کشف الظنون اور ہدیۃ العارفین میں کیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی علامہ تفتازانی کی جانب بعض تصنیفات منسوب کی جاتی ہیں لیکن تحقیق کی نگاہ میں وہ جعلی ہیں، لہٰذا ان کے بیان سے کوئی فائدہ نہیں، جن کو شوق ہو وہ عبداللہ علی حسین الملا کی کتاب ''التفتازانی وموقفہ من الالٰہیات'' میں سے القسم الثالث: الکتب المنحولۃ کے باب کا مطالعہ کرلیں، وہاں پر تفصیل سے اس پر بحث موجود ہے۔

علامہ جرجانی کی دربارِ شیراز تک رسائی میں مدد

بعض مآخذ میں یہ روایت ملتی ہے کہ علامہ تفتازانی شاہ شجاع کے دربار سے وابستہ تھے، انہی ایام میں ایک دن علامہ سید شریف جرجانی آپ سے سپاہیانہ لباس میں ملے اور کہا کہ میں ایک ماہر تیرانداز ہوں، آپ والی کے پاس میری سفارش کردیں، علامہ تفتازانی سید صاحب کو لے کر والی کے پاس گئے اور ان کی تیراندازی کی مہارت کی تعریف کی، والی نے تیراندازی کی مہارت کی عملی مشق کا حکم دیا، اس وقت سید صاحب نے کچھ کاغذات نکال کر شاہ شجاع کو دیئے جس میں مشہور مصنفین کی عبارتوں پر اعتراضات وایرادات تھے اور کہا کہ یہی میرے تیر ہیں، شاہ شجاع خود عالم تھا، وہ سید صاحب کی قابلیت سے بہت متاثر ہوا اور ان کو دارالشفاء میں تدریس کی خدمت پر مامور کردیا اور جب تیموری حملہ نے شاہ شجاع کی سلطنت کا خاتمہ کیا تو وہ سید صاحب کو اپنے ساتھ سمرقند لے گیا۔(۱)

علامہ جرجانی اور علامہ تفتازانی کی علمی چپقلش

جن علوم وفنون پر علامہ سعدالدین تفتازانی کو فخر تھا، علامہ سید شریف جرجانی کو بھی ان ہی علوم وفنون میں امامت کا دعویٰ تھا، اور جب دونوں ایک ہی دربار یعنی تیموری دربار سے وابستہ ہوگئے تو مختلف مسائل میں اختلاف ہوا، دونوں کے درمیان مختلف مسائل اور مباحث پر مناظرے ہوئے، اور ان مناظرات نے آگے بڑھ کر مخاصمت اور نفرت کی شکل اختیار کرلی۔

---

(۱) الفوائد البهية في تراجم الحنفية: 134۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ بیشتر مناظروں میں سید صاحب کا پلہ بھاری رہا، اوراس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ تیمور خود سید صاحب کا طرفدار تھا اوران کی سیادت کی وجہ سے سید صاحب کو علامہ تفتازانی پر فوقیت دیتا تھا، دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ سید شریف جرجانی فصیح وبلیغ اور طلاقت لسانی میں کمال رکھتے تھے، جب کہ دوسری جانب علامہ تفتازانی لکنت کی وجہ سے اس درجہ موثر خطاب وتقریر نہیں کرسکتے تھے اور مناظرہ ومباحثہ کی مجالس ومحافل میں وہی بازی لوٹ سکتا ہے جو طلاقت لسانی کا کمال رکھتا ہو۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ سید صاحب سرے سے غلط ہوتے تھے، بعد کے محققین نے دونوں کے درمیان مختلف فیہ مسائل میں فیصلہ کیا ہے کہ کس مسئلہ میں کون مصیب اور کون مخطی ہے؟ علامہ مستجی زادہ (م:۱۱۵۰ھ) نے سید صاحب اور علامہ تفتازانی کے اختلافات کو ایک کتاب میں جمع کردیا ہے جس کا نام ''اختلاف السعدین'' ہے، ان کے علاوہ علامہ طاش کبریٰ زادہ نے بھی دونوں کے اختلاف کو اپنی ایک تصنیف میں جمع کیا ہے، دونوں کے موقف کے لئے دلائل دیئے ہیں اور پھر محاکمہ کیا ہے، ان کی کتاب کا نام ''مسالک الخلاص فی مہالک الخواص'' ہے۔

ایک مناظرہ

سید صاحب اور علامہ تفتازانی کے درمیان علامہ جاراللہ زمخشری کی کشاف پر ایک عبارت سے اختلاف شروع ہوا، وہ اختلاف صاحب کشاف کی ایک عبارت میں ہوا کہ اس میں صرف استعارہ تبعیہ ہے یا استعارہ تبعیہ اور تمثیلیہ دونوں ہیں، سید صاحب کا موقف صرف استعارہ تبعیہ کا تھا، اور علامہ تفتازانی کا استعارہ تبعیہ اور استعارہ تمثیلیہ دونوں کا تھا، دونوں طرف سے اپنے اپنے دلائل دیئے گئے، اور بڑھتے بڑھتے اس نزاع نے مخاصمت اور جدال کی شکل اختیار کرلی، اوراسی پر تیمور کے دربار میں دونوں کے درمیان مناظرہ ہوا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مناظرہ بڑے اہتمام اور تزک واحتشام کے ساتھ شروع ہوا؛ کیوں کہ اس مناظرہ کے لئے حکم بھی متعین کیا گیا تھا اور حکم تھے مشہور معتزلی عالم علامہ نعمان الدین خوارزمی، مناظرہ کے اختتام پر حکم نے سید صاحب کے حق میں فیصلہ سنایا اور تیمور لنگ نے علامہ تفتازانی سے کہا کہ میں اگر مان بھی لوں کہ آپ دونوں علم وفضل میں برابر ہیں تب بھی سید صاحب کو سیادت کا مزید فضل حاصل ہے، اس لئے ان کو ترجیح دوں گا، علامہ تفتازانی کو معتزلی عالم کے غلط فیصلے سے (ان کے اپنے احساس کے مطابق) اور تیمور لنگ کی مزید نشتر زنی سے بہت صدمہ ہوا، (۱) علامہ لکھنوی نے اسی واقعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اسی مناظرہ میں شکست کے احساس غم اور شدت صدمہ سے ان کی جان چلی گئی؛ لیکن ان کی یہ بات غلط ہے؛ کیوں کہ یہ مناظرہ ۷۹۱ھ میں ہوا تھا، اوراس کے فوری بعد علامہ تفتازانی کا انتقال نہیں ہوا ہے؛ بلکہ اچھی خاصی مدت کے بعد ہوا ہے، ان کے انتقال کی تاریخ پر بحث آگے آرہی ہے۔

(۱)　الفوائد البہیۃ:۱/۱۲۹-۱۳۰۔

علامہ جرجانی اور علامہ تفتازانی کا موازنہ

دونوں ہی جبالِ علم میں سے ہیں ، اور دونوں کی تصانیف کو قبولیت عامہ کی نعمت خداداد ملی ، دونوں کی تصانیف نے برسوں تک علماء کو اور ذہین ترین لوگوں کو اپنی تصنیفات کی تدریس وتحشیہ اور تلخیص وتشریح میں مصروف رکھا، اور یہی ان دونوں کی عظمت ورفعت شان کے ثبوت میں کافی ہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ علامہ تفتازانی سے علامہ سید شریف جرجانی نے استفادہ کیا ہے، ان کی تحقیقات اور تدقیقات سے وہ بہرہ ور ہوئے ہیں، اس بارے میں علامہ کفوی فرماتے ہیں :

> سید شریف ابتداء تالیف وتصنیف میں علامہ تفتازانی کی تحقیقات اور ان کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے اور علامہ جرجانی بھی علامہ تفتازانی کے رفعت شان اور علوم مقام کے معترف تھے۔(۱)

اوراسی سے ملتی جلتی رائے کا اظہار خود مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے بھی کیا ہے ؛ چنانچہ وہ سید صاحب اور علامہ تفتازانی دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> میں نے علامہ تفتازانی کی تصانیف میں سے زنجانی کی شرح جو سعدیہ کے نام سے مشہور ہے ، اس کا اور تلخیص کی دونوں شرحوں کا اور شرح شمسیہ کا اور تلویح کا اور شرح عقائد نسفی کا اور مختصر کی شرح کے حاشیہ کا اور مقاصد اوراس کی شرح کا اور تہذیب کا اور مفتاح کی شرح کی اور کشاف کے حواشی کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی تمام تصانیف اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ علامہ تفتازانی علم کے ایسے سمندر ہیں جس کا کوئی کنارہ نہیں ، اور ایسے زبردست عالم ہیں جن کو کوئی جھکا نہیں سکتا ، اور ذہانت میں اگرچہ علامہ جرجانی علامہ تفتازانی سے فائق معلوم ہوتے ہیں ؛ لیکن وہ وسعت نظر اور دقت فکر میں علامہ تفتازانی کے مقام تک نہیں پہنچتے۔(۲)

علامہ تفتازانی حنفی ہیں یا شافعی؟

علامہ تفتازانی کے بارے میں مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کا اختلاف ہے کہ وہ حنفی ہیں یا شافعی ہیں، صاحب

---

(۱) الفوائدالبهية في تراجم الحنفية :136۔

(۲) الفوائدالبهية في تراجم الحنفية :136۔

کشف الظنونؒ علامہ کفویؒ اور حافظ سیوطیؒ وغیرہم نے ان کو شافعی کہا ہے، (۱) جب کہ ابن نجیم، ملا علی قاری اور سید احمد طحطاوی رحمہم اللہ وغیرہم نے ان کے حنفی ہونے کی بات کہی ہے، (۲) علامہ لکھنوی بھی ان کو شافعی مانتے ہیں اور جن لوگوں نے ان کو حنفی قرار دیا ہے، ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

واختلفوا في وصف معاصره وخصمه سعد الدين التفتازاني فطائفة جعلوه حنفيا اغترارا بتصانيفه في الفقه الحنفي ۔ (۳)

لیکن علامہ لکھنوی کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ وہ نہ پورے طور پر حنفی ہیں اور نہ پورے طور پر شافعی ہیں؛ بلکہ دونوں مذہب کے محقق ہیں، علامہ لکھنوی کی یہ رائے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اقامۃ الحجۃ کے حاشیہ میں نقل کیا ہے :

والذی یظهر انه محقق المذهبین ، لا شافعی کالشافعیة ، ولا حنفی کالحنفیة ۔ (۴)

علامہ تفتازانی کے بارے میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ دونوں فقہ حنفی وشافعی کے محقق ہیں نہ وہ پورے طور پر شافعی ہیں اور نہ پورے طور پر حنفی۔

لیکن اس بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ وہ ایک بڑے وسیع النظر عالم، متبحر متکلم، فقہ اور اُصولِ فقہ گہری نگاہ رکھنے والے حنفی ہیں، اور اس کے دلائل حسب ذیل ہیں :

(۱) انھوں نے زیادہ تر فقہ حنفی اور حنفی اُصولِ فقہ میں لکھی گئی کتابوں کی شرح وتحشیہ کیا ہے، کوئی شافعی عالم کسی حنفی فقیہ کی کتاب کی شرح لکھے، یا اس پر حاشیہ لکھے یہ بہت شاذ ونادر ہے، دیگر علوم وفنون میں تو ایسا بکثرت ہے؛ لیکن فقہ میں اور اُصول فقہ میں اس کی مثالیں کمیاب بلکہ نادر ہیں، آپ نے مشہور حنفی فقیہ سجاوندی کی مشہور عالم کتاب ''الفرائض السراجیہ'' جو میراث کے موضوع پر ہے کی شرح لکھی ہے۔

صدر الشریعہ عبداللہ بن مسعود محبوبی نے اُصول فقہ میں ایک کتاب لکھی، جس کا نام تنقیح رکھا، پھر اس کی خود ہی ایک شرح لکھی جس کا نام توضیح ہے، اسی متن اور شرح پر ایک فاضلانہ حاشیہ یا شرح علامہ تفتازانی نے لکھا جو تلویح کے نام سے مشہور ہے، علامہ تفتازانی نے یہ جب شرح یا حاشیہ لکھا تھا، تو اس وقت ان کی عمر محض ۳۶ سال تھی، اور اس علمی کم سنی میں انھوں نے جو حاشیہ لکھا ہے، اس نے ہر دور میں اکابر علماء سے خراج تحسین حاصل کیا ہے اور صدیوں

---

(۱) دیکھئے: ۲/ ۲۸۵، بغیۃ الوعاۃ: کشف الظنون: ۱/ ۴۹۸، الفوائد البہیۃ: ۱۳۵۔

(۲) دیکھئے: الفوائد البہیۃ: ۱۳۵۔

(۳) الفوائد البهية في تراجم الحنفية: 134۔

(۴) اقامة الحجة: ۱۶۔

تک یہ کتاب داخل نصاب رہی اور اجلہ علماء نے اس کی مختلف جہتوں سے خدمت کی، اسی شرح کے بارے میں فخر متاخرین مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ لکھتے ہیں :

وقد نطق هذا الكتاب بفضله ، وشهد بعلمه ، وكيف لا وكان استاذ العلماء المتاخرين وسيد الفضلاء المدققين ۔ (۱)

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ تلویح کے بارے میں فرماتے ہیں :

مع أن حاشية الامام السعد التفتازانی ''التلويح'' من خير من كتب على التوضيح ، وفي غاية من الانصاف والتحقيق دون تعصب او تمحل مذهبي ، بل لوقيل : لولا ها لما كان لكتاب ''التوضيح'' المكانة العلمية التي يحتلها لكان ذلک صحيحا ۔ (۲)

اس کے علاوہ علامہ تفتازانی کی ایک اور تصنیف ''الفتاویٰ الحنفیۃ'' کے نام سے ہے، اس کے علاوہ آپ نے علامہ سروجی کی ہدایہ کی شرح کا تکملہ لکھا ہے، علاوہ ازیں امام محمد بن الحسن الشیبانی کی وجہ سے مشہور عالم کتاب الجامع الکبیر ہے، جس کی بہت سے علماء اور فقہاء نے مختلف جہتوں سے خدمت کی ہے، کسی نے شرح لکھی، کسی نے خلاصہ کیا، کسی نے حاشیہ چڑھایا، وغیر ذلک، جن حضرات نے جامع کبیر کی تلخیص کی ہے، ان میں سے ایک مشہور حنفی فقیہ کمال الدین محمد بن عباد بن ملک خلاطی ہیں، ان کی تلخیص کی متعدد فقہاء نے شرح لکھی ہے، ان شروحات میں سے ایک امام مسعود بن محمد غجدوانی کی شرح ہے، علامہ سعدالدین تفتازانی نے اسی شرح کا اختصار اور تلخیص کرنا شروع کیا اور اس کا نام ''مختصر شرح تلخیص الجامع الکبیر'' رکھا، منقول ہے کہ جب امام غجدوانی تک لوگوں نے یہ خبر پہنچائی کہ علامہ تفتازانی نے آپ کی شرح کا خلاصہ کرنا شروع کر دیا ہے اور ان کی تصنیفات کی مقبولیت کے پیش نظر اندیشہ ہے کہ آپ کی یہ شرح گمنامی کی نذر ہو جائے گی، تو اس پر امام غجدوانی نے فرمایا کہ ان کی یہ تصنیف مکمل نہیں ہوگی؛ چنانچہ اس تصنیف کی تکمیل سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔(۳)

(۲) اس زمانے میں رواج یہ تھا کہ جہاں شافعی اور حنفی دونوں ہوتے تھے، تو دونوں مسلک کے قاضیوں کو متعین کیا جاتا تھا، حنفیوں کے معاملات فیصل کرنے کے لئے حنفی قاضی اور شافعیوں کے معاملات فیصل کرنے کے لئے شافعی قاضی، علامہ تفتازانی حنفیوں کے قاضی تھے، اس کا ذکر متعدد علماء نے کیا ہے، (۴) اس کے علاوہ علامہ تفتازانی نے ہدایہ کے خطبہ کی شرح بھی لکھی ہے۔

(۱) فرحة المدرسين، بحواله التفتازانی وموقفه من الالهيات: ۱/ ۲۵۴۔ (۲) اقامۃ الحجۃ، ص: ۱۷۔

(۳) کشف الظنون: ۱/ ۴۷۳۔

(۴) فرحۃ المدرسین مخطوطہ، بحوالہ: التفتازانی وموقفہ من الالہیات: ۱۸۲، فتح الغفار: ٦، الفوائد البہیۃ: ۱۳۵۔

جواس بات کی بڑی دلیل ہے کہ وہ حنفی تھے، اگر وہ شافعی ہوتے تو شوافع کے قاضی بنتے، نہ کہ حنفیوں کے قاضی بنتے۔

(۳) اورسب سے بڑھ کر داخلی شہادت یہ ہے کہ انھوں نے فقہ اور اُصولِ فقہ میں لکھی گئی کتابوں میں احناف کے موقف کے لئے امام شافعی کے مقابل اصحابنا کی اصطلاح استعمال کی ہے، اگر وہ شافعی ہوتے تو پھر احناف کے موقف کے لئے اصحابنا کی اصطلاح کبھی استعمال نہیں کرتے، حضرت شیخ عبدالفتاح نے اس سلسلے میں ان کی توضیح پر مایہ ناز شرح تلویح سے کچھ اقتباسات پیش کئے ہیں، ذیل میں ان ہی کے افادہ کوسامنے رکھ رہا ہوں۔

احناف عام کو قطعی مانتے ہیں، اور شوافع اس کے برعکس نقطۂ نظر کے حامل ہیں، علامہ تفتازانی تلویح میں اس بارے میں فرماتے ہیں :

و اذا ثبت هذا ای کون العام قطعیا عندنا خلافاً للشافعی ... فعند الشافعی یخص العام بالخاص ... وعندنا یثبت حکم التعارض۔ (۱)

مفہوم مخالف کے بارے میں معلوم ہے کہ احناف کے یہاں حجت نہیں جب کہ شوافع کے یہاں حجت ہے، اس بحث میں علامہ تفتازانی فرماتے ہیں :

فعنده ای الشافعی لا یجوز نکاح الامة عند استطاعة نکاح الحرة ... وعندنا هوم عدم اصلی فلایصلح مخصصا ... علی ماهو مذهب الشافعی رحمه الله تعالیٰ ... ولا ناسخا علی ما هو مذهبنا۔ (۲)

مامور بہ کی دو قسم ادا اور قضا کے بارے میں میں علامہ تفتازانی لکھتے ہیں :

واختلفوا فی القضاء بمثل معقول ، فعند البعض بسبب جدید ... وعند جمهور اصحابنا کالقاضی ابی زید وشمس الائمة وفخر الاسلام رحمهم الله تعالیٰ القضاء یجب بالدلیل...۔ (۳)

علت کی بحث میں — کہ علت کی شناخت میں تیسرا طریقہ مناسبت کا ہے — علامہ تفتازانی لکھتے ہیں :

... فالتعلیل لا یقبل مالم یقم الدلیل علی کون الوصف ملائما ، وبعد الملائمة لایجب العمل به الابعد کونه موثرا عندنا ، ومخیلا عند اصحاب الشافعی رحمه الله تعالیٰ۔

(۱) تلویح:۱؍۴۱۔ (۲) تلویح:۱؍۱۴۶۔ (۳) تلویح:۱؍۱۶۲۔

اس کے علاوہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے تلویح مطبوعہ مصر مطبع مصطفیٰ البابی سنہ ۱۳۲۷ء سے مزید حوالے دیئے ہیں، ذیل میں اس کو نقل کیا جاتا ہے۔

۱/۱۹۶، ۲/۸، ۲/۱۷، ۲/۱۸، ۲/۲۰/۲۱، ۲/۷۵، ۲/۱۰۱، ۲/۱۰۴، ۲/۱۱۱، ۲/۱۲۵

کچھ اعتراضات اور اس کے جوابات

شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کے دلائل پر ایک افغانی عالم محمد محمدی بن محمد جمیل نورستانی نے نقد کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ شافعی یا اقرب الی الشافعیہ ہیں، ان کی کتاب کا نام ''مواقف التفتازانی الاعتقادیۃ فی کتابہ شرح العقائد النسفیۃ'' ہے میں نے ان کی کتاب پڑھ کر سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے، اور اس کا تجزیہ کرنے کی کہ شیخ ابوغدہ کے خلاف ان کے دلائل میں کتنا دم اور کتنی جان ہے۔

محمد محمدی صاحب کی اصل بحث یہ ہے کہ حنفی ماتریدی ہوتے ہیں، اشعری نہیں ہوتے اور شافعی و مالکی اشعری ہوتے ہیں، ماتریدی نہیں، اور علامہ تفتازانی اشعری ہیں؛ لہٰذا اس سے ان کا شافعی ہونا ثابت ہوا؛ کیوں کہ ان کے مالکی اور حنبلی ہونے کا دعویٰ کسی نے نہیں کیا؛ لہٰذا ان کے اشعری ہونے کی بات ثابت ہونے کے بعد لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ اشعری ہیں، محمد محمدی صاحب شمس افغانی کے حوالہ سے لکھتے ہیں :

> میں نے اس بارے میں بڑی چھان بین کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ماتریدیہ تمام کے تمام حنفی ہوتے ہیں ؛ بلکہ علم کلام میں ماتریدیہ سے مراد مطلقاً حنفی ہیں ہوتے ہیں اور بس اور میں نہیں جانتا کہ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ میں سے کوئی ماتریدی رہا ہو، جیسا کہ میں نہیں جانتا کہ حنفیہ میں سے کوئی اشعری رہا ہو، سوائے ابوجعفر محمد بن احمد سمنانی کے، یہ فروع میں حنفی اور اُصول میں اشعری تھے، اور یہ علم کلام میں باقلانی کے شاگرد تھے اور وہ ان کو مزاحاً مومن آل فرعون کہتے تھے، یہ حنفیوں میں تنہا اشعری تھے، جہاں تک اشاعرہ کی بات ہے تو وہ مختلف اسباب کی وجہ سے زیادہ تر شوافع میں سے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ امام ابوالحسن اشعری خود شافعی تھے۔(۱)

اشاعرہ اور ماتریدیہ میں اختلاف کی قلت

حقیقت یہ ہے کہ یہ پورا پیراگراف کئی مغالطوں سے پر ہے، جس کو ہم ان شاءاللہ بیان کریں گے، اولاً تو ماتریدیہ اور اشاعرہ کے درمیان فرق ہی نہایت کم ہے، اور یہ اتنا کم ہے کہ بعض اہل علم نے تو ماتریدی اور اشعری کے

(۱) مواقف التفتازانی الاعتقادیۃ فی کتابہ شرح العقائد النسفیۃ: ۱/293۔

بارے میں کہا ہے کہ دونوں ایک ہی ہیں، بس نام الگ الگ ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دونوں میں اختلافی مسائل کی تعداد ندرت کی حد تک کم ہے، مشہور محدث اور شافعی فقیہ شیخ تاج الدین سبکیؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ دونوں کے درمیان اختلافی مسائل کی تعداد صرف تین ہے اور پھر اپنی تحقیق بیان کرتے ہیں کہ اختلافی مسائل تیرہ ہیں، جن میں سے سات میں اختلاف محض لفظی ہے اور چھ میں معنوی اختلاف ہے، علامہ تاج الدین سبکیؒ کی اس بات کی تائید علامہ مرتضیٰ زبیدی اور علامہ مقریزی نے بھی کی ہے، (١) کمال یہ ہے کہ خود علامہ تفتازانی نے اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان محض تین مسائل میں اختلاف کا اعتراف کیا ہے اور اس میں سے بھی ایک میں اختلاف کو وہ لفظی مانتے ہیں، (٢) سوال یہ ہے کہ دو گروپ میں اگر اتنا کم فرق ہو کہ محض دو تین مسائل میں اختلاف ہو تو کیا یہ کوئی بڑا اختلاف ہے، اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر ہر اشعری ماتریدی ہے اور ہر ماتریدی اشعری ہے، محض نام کا فرق ہے ورنہ اُصولی طور پر دونوں ایک ہی ہیں؛ لہٰذا ان کی یہ کوشش کہ علامہ تفتازانی کو اشعری ثابت کر کے شافعی ثابت کریں یا شافعی ثابت کر کے اشعری ثابت کریں، لا حاصل اور بے فائدہ ہے۔

شافعی ماتریدی

دوسری بات یہ ہے کہ حنفی ماتریدی ہوتے ہیں، اشعری نہیں ہوتے، ایک بے بنیاد دعویٰ ہے، اور ابوجعفر سمنانی کے مومن آل فرعون کے جملہ سے دلیل پکڑنا غلط ہے؛ کیوں کہ بعینہٖ یہی جملہ ملک معظم شرف الدین عیسیٰ نے بھی اپنے بارے میں کہا تھا، جب وہ شافعی سے حنفی ہو گئے تھے، جب ان کے والد نے ان سے کہا کہ تمہارے سارے گھر والے شافعی ہیں تو پھر تم حنفی کیوں ہو گئے، انھوں نے جواب میں کہا: ''کیا آپ کو یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ اس گھر میں ایک مسلمان بھی ہو''۔ (٣)

اس جملہ کو بعض لوگوں نے تعصب پر محمول کیا ہے؛ حالاں کہ اس کو بھی خوش طبعی پر محمول کیا جا سکتا ہے جیسا کہ امام باقلانی کے کلام مومن آل فرعون کو خوش طبعی پر محمول کیا گیا ہے، اب اگر کوئی ملک معظم کے اس جملہ سے یہ استدلال کرنے لگے کہ شافعی سے حنفی بہت کم ہوئے ہیں تو یہ اس کی رجال وتراجم کی تاریخ سے ناواقفیت کا ہی ثبوت ہوگا، تاریخ میں مختلف مسالک کے علماء اپنے مسلک کو چھوڑ کر دوسرا مسلک اختیار کرتے رہے ہیں، اور اس کی بہت ساری مثالیں کتب تاریخ وتراجم میں موجود ہیں، میں نے محض بکر بن عبداللہ ابوزید کی کتاب ''النظائر'' کی ورق گردانی کی تو مجھے ٣٦/ ایسے نام ملے جو شافعی سے حنفی ہوئے تھے، اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں تمام نام ذکر کرتا، جن کو شوق ہے وہ النظائر میں تحول مذہبی کا پورا باب پڑھیں۔

---

(١) دیکھئے: الطبقات: ٣/ ٣٧٨، وإتحاف السادۃ: ٢/ ٨-١٠، الخطط: ٣٥٩۔

(٢) شرح المقاصد: ٥/ ٢٣٢۔ (٣) الفوائد البہیۃ: ١٥٢۔

شیخ شمس الدین سلفی یہ دعویٰ فرماتے ہیں کہ کوئی شافعی ماتریدی نہیں ہوتا :

ولا اعرف احدا من المالكية والشافعية والحنابلة أن يكون ماتريديا۔

اوران کے شاگرد محمد محمدی صاحب اس دعویٰ کومن وعن قبول کر لیتے ہیں؛ حالاں کہ اگر وہ محض علامہ تفتازانی کے اساتذہ کے حالات کا بغور مطالعہ کرتے تو ان کو پتہ چلتا کہ ان کے اساتذہ میں بالخصوص جن سے انھوں نے حدیث کا علم حاصل کیا ہے، ضیاء بن سعداللہ قزوینی قرمی ہیں: آپ اپنے بارے میں فرماتے تھے کہ میں فروع میں شافعی اور اُصول میں حنفی ہوں، (۱) اورخود یہ مثال شیخ شمس الدین سلفی کے اس دعویٰ کو رد کرنے کیلئے کافی ہے کہ کوئی شافعی ماتریدی نہیں۔

حنفی اشعری

یہ دعویٰ کہ حنفی اشعری نہیں ہوتے، شیخ شمس الدین سلفی صاحب جنھوں نے ماتریدیہ کے خلاف کتابیں لکھی ہیں، بتاتا ہے کہ ان کا مطالعہ اس باب میں یکطرفہ ہے، اگر وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حالات کو ہی بغور پڑھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے زیر درس صحیح بخاری کا نسخہ جو بانکی پور پٹنہ خدابخش لائبریری میں ہے، اس میں صراحتاً حضرت شاہ صاحب کے قلم سے لکھا ہے کہ وہ عملاً حنفی اورعقیدتاً اشعری ہیں (بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعۃ جلداول، مقدمہ) ان سب سے ہٹ کر المہند علی المفند میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری صاحب نے صاف لکھا ہے کہ علماء دیو بند عقیدہ میں اشعری اور ماتریدی ہیں، (کمال یہ ہے کہ اس پر شیخ شمس الدین سلفی صاحب کی نگاہ ہے؛ لیکن وہ اس کو اشاعرہ اور ماتریدیہ کے مابین اختلاف کم ہونے کے طور پر دیکھتے ہیں؛ لیکن اس بات سے صرف یہی ثابت نہیں ہوتا؛ بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حنفی بھی اشعری ہوتے ہیں؛ لیکن چوں کہ یہ ان کے مزعوم کے خلاف ہے، اس لئے وہ اس سے صرف نظر کر لیتے ہیں)۔

زمانی طور پر امام اشعری سے سب سے زیادہ قریب اوران کی جانب سے دفاع کرنے والے حافظ ابن عساکرؒ ہیں، آپ تبین کذب المفتری میں صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں :

فَلَمَّا كثرت تواليفه وَنصر مَذْهَب السّنة وَبسطه تعلق بهَا أهل السّنة من الْمَالِكِيَّة وَالشَّافِعِيَّة وَبَعض الْحَنَفِيَّة ۔ (۲)

---

(۱) انباء الغمر: 1/283۔

(۲) تبيين كذب المفتري فيما نسب إلى الأشعري: 117۔

اس میں صراحت کے ساتھ ابن عساکر کہہ رہے ہیں بعض حنفی امام اشعریؒ کے متبع تھے، اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ حافظ ابن عساکرؒ فرماتے ہیں :

وَكَثْرَة الأَصْحَاب من الْحَنَفِيَّة والمالكية وَالشَّافِعِيَّة الَّذين رَغِبُوا فِي علم الْأُصُول وأحبوا معرفة دَلَائِل الْعُقُول ۔ (۱)

اس میں واضح ہے کہ حافظ ابن عساکر کہہ رہے ہیں کہ امام اشعری کے بہت سارے متبع یا شاگرد حنفیہ، مالکیہ اور شوافع میں سے ہیں، انھوں نے عقیدہ وتوحید کے باب میں ان سے عقلی دلائل کا علم حاصل کیا ہے۔

اس پوری بحث سے یہ بات واضح ہے کہ محمد محمدی صاحب کا کہنا کہ اشعری شافعی ہوتے ہیں اور علامہ تفتازانی اشعری ہیں؛ لہٰذا وہ شافعی ہوئے، دلائل کے اعتبار سے ناقابل توجہ اور محض قیاس آرائی ہے۔

واضح رہے کہ محمد محمدی صاحب نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں علامہ تفتازانی کے حالات میں ان کے شافعی ہونے کا ایجابی ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ وہ اشعری ہیں لہذا شافعی ہیں، حالانکہ یہ کوئی دلیل نہیں بلکہ قیاس آرائی ہے، جس کی غلطی واضح ہوچکی ہے۔

کتب طبقات اور علماء احناف

اس کے علاوہ ایک منفی دلیل یہ بتائی ہے کہ طبقات احناف پر لکھی گئی کتابوں میں ان کا تذکرہ نہیں ملتا، اگر وہ حنفی ہوتے تو ان کا تذکرہ ضرور ہوتا، وہ لکھتے ہیں :

ومن اوضح الادلة على عدم كونه حنفيا : عدم ذكر كثير ممن كتب في طبقات الحنفية ، فاذا تذكرنا ان اصحاب الطبقات كثير اما يذكرون في طبقاتهم من ليس منهم قطعا ۔ (۲)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ احناف نے اپنے طبقات کی کتابوں میں معتزلی، جہمی اور فلاسفہ تک کو شامل کیا ہے تو علامہ سعد الدین تفتازانی جیسے شہرۂ آفاق شخصیت کو تو بدرجہا شامل کیا جانا چاہئے، اور جب اس کے بعد بھی انھوں نے شامل نہیں کیا ہے تو اس سے یہ بات واضح ہے کہ وہ حنفی نہیں تھے۔ (۳)

---

(۱) تبيين كذب المفتري فيما نسب إلى الأشعري: 102۔

(۲) حوالۂ سابق: ۱/ ۳۰۰۔

(۳) حوالۂ سابق: ۱/ ۳۰۰۔

اس اعتراض کے کئی جواب ہیں :

(۱) اُصولی طور پر یہ بھی کوئی دلیل نہیں ہے، محض قرینہ ہے، اور قرینہ اور دلیل میں بہت فرق ہے، صرف قرینہ سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی، قرینہ دلیل میں تھوڑی مضبوطی پیدا کرتا ہے یا رجحان کو واضح کرتا ہے، دلیل کا کام قرینہ سے لینا اُصول مباحثہ سے بے خبری کی دلیل ہے، چہ جائے کہ قرینہ کو اوضح الا دلہ بنایا جائے۔

(۲) کسی کے حنفی ہونے کا معیار اگر یہ ٹھہرے کہ اس کا نام کتب طبقات میں ضرور آئے تو پھر بہت سارے حنفی علماء اس کی بنیاد پر احناف کی لسٹ سے خارج ہو جائیں گے؛ کیوں کہ اُمت کی مجموعی تعداد کا دو تہائی یا نصف احناف پر مشتمل رہا ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علماء کی تعداد لاکھوں میں بنتی ہے، مگر کتب طبقات میں یہ تعداد محض ہزاروں تک ہی محدود ہے اور طبقات احناف پر لکھی گئی کتابوں میں سے الجواہر المضیۃ اور الطبقات السنیہ میں یہ تعداد دو ہزار تراجم تک بھی نہیں پہنچتی ہے، ایسے میں کتب طبقات میں نہ ہونے سے یہ استدلال کرنا کہ فلاں کا ذکر نہیں آیا ہے، اس لئے فلاں حنفی نہیں ہے، انتہائی غلط بات ہے۔

(۳) کیا کسی بھی حنفی نے یا کسی بھی قابل ذکر عالم نے یہ بات کہی ہے کہ طبقات میں اگر کسی عالم کا ذکر نہ ہو تو وہ اس مسلک کا فرد نہیں رہا، ظاہر سی بات ہے کہ یہ بات بداہتاً غلط ہے، صرف حنفیوں کی بات نہیں، یہ بات شوافع، مالکیہ، حنابلہ میں سے کوئی نہیں کہتا کہ اگر کسی کا ذکر کتب طبقات میں نہیں ہے تو وہ مالکی، شافعی اور حنبلی نہیں ہے، ایسی بات کو معیار ٹھہرانا جس کو کوئی تسلیم نہیں کرتا، کس درجہ غلط ہے، بتانے کی ضرورت نہیں۔

اب اس پر یہ سوال ضرور ہونا چاہئے کہ علامہ سعد الدین تفتازانی مشہور شخصیت ہیں، ان کی کتب اور شرح وحواشی کو علماء نے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور صدیوں تک ان کی کتابیں درس کا حصہ رہی ہیں اور آج بھی ہیں، تو ان کا معاملہ دیگر علماء کے جیسا نہیں ہے، ان کے جیسی شہرہ آفاق شخصیت کا نام تو ضرور ہونا چاہئے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ سعد الدین تفتازانی ایک متبحر عالم تھے اور اسی کے ساتھ مسلک میں نہایت انصاف پسند، اگر احناف کی کوئی بات دلائل کے لحاظ سے کمزور ہے تو اس کو کھل کر بیان کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ بعض حنفی علماء ان کی انصاف پسندی کو نہ سمجھ سکے اور ان کو احناف پر حملہ کرنے والا تصور کرلیا اور ان کے خلاف کتاب بھی لکھی جیسا کہ شیخ ابوغدہ نے بھی لکھا ہے کہ ان کو شافعی سمجھ کر شیخ الاسلام زکریا انصاری نے تلویح کی شرح لکھی اور مشہور حنفی عالم شہاب مرجانی نے ان کو شافعی سمجھ کر ان پر سخت حملہ کیا؛ لیکن ایسے انصاف پسند اور تعصب سے دور علماء کی احناف میں مثالیں بکثرت ہیں، متاخرین میں سے مولانا عبدالحی فرنگی محلی اس کی واضح مثال ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ اس کی واضح مثال ہیں، ان سے پہلے دیکھنا ہو تو ابن ہمام وغیرہ بھی اس کی مثال ہیں، اور ان سے بھی پہلے دیکھنا ہو تو ابن ابی العز حنفی اس کی واضح مثال ہیں، انھوں نے ہدایہ پر اپنے اشکالات واعتراض پر مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے: ''التنبیہ علی مشکلات الہدایہ''۔

علامہ تفتازانی کی انصاف پسندی اور بعض حنفی علماء کی ان کے خلاف تنقید سے ان کے شافعی ہونے کا تصور مشہور ہوا ہو، اور اس میں کچھ مزید باتیں تائید میں بھی مل گئی ہوں، جیسے ان کے اساتذہ بالخصوص علم کلام اور حدیث کے شافعی ہیں، وہ اپنی کتاب میں اشاعرہ کی حمایت کرتے ہیں، اس کے علاوہ فقہ شافعی میں ان کی تصنیف ہے جس کا نام مفتاح ہے، علامہ سید شریف جرجانی جن کی حنفیت شبہ سے بالاتر ہے، ان سے ان کے مناظرے وغیرہ، ان ہی باتوں نے ہوسکتا ہے کہ بعض کتب طبقات کے مصنفین کو اس پر مائل کر دیا ہو کہ وہ ان کا ذکر نہ کریں، اور بعض نے ان کو شافعی مان لیا۔

(۴) یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ ایسا نہیں ہے کہ کتب طبقات پر لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی ان کو حنفی تسلیم ہی نہ کیا ہو، ملا علی قاری کا علم فقہ وحدیث اور تراجم ورجال میں جو مقام ومرتبہ ہے، وہ محتاج تعارف نہیں ہے، اس کے علاوہ ان کو ایک مزید مزیت یہ حاصل ہے کہ وہ علامہ تفتازانی کے وطن اور ان کے مسکن سے بہت قریب کے ہیں، اس بناء پر ان کے تعلق سے ان کی بات مزید اہمیت کی حامل ہوجاتی ہے، اور ملا علی قاریؒ نے الأثمار الجنیۃ فی طبقات الحنفیہ (جلد دوم، ترجمہ نمبر: ۴۳۶) میں ان کا ذکر کیا ہے۔

(۵) ہم مزید آگے بڑھتے ہیں کہ کسی حنفی عالم کا کتب طبقات میں ذکر نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حنفی نہیں ہے، ذیل میں صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں، العقیدۃ الطحاویہ کے مشہور شارح ابن ابی العز الحنفی ہیں، ہر جگہ ان کے نام کے ساتھ حنفی کا لاحقہ پایا جاتا ہے، طبقات احناف کی کسی بھی کتاب میں ان کا ذکر نہیں ہے، تو کیا محمد محمدی صاحب ان کو حنفی نہیں تسلیم کریں گے؟ بالخصوص جب کہ وہ عقیدہ میں بھی ان کے زعم وخیال کے مطابق سلفی ہیں، تو یہاں پر دو باتیں ہوگئیں، کتب طبقات احناف میں ابن ابی العز حنفی کا ذکر نہیں اور دوسرے عقیدہ میں بھی وہ ماتریدی نہیں تو پھر محمد محمدی صاحب کی منطق کے مطابق تو ان کو حنفی نہیں ہونا چاہئے؛ لیکن سلفیہ حضرات بشمول شیخ البانی ودیگر جنھوں نے بھی عقیدہ طحاوی ابن العز کی شرح کے ساتھ شائع کیا ہے، سبھی نے ان کے نام کے ساتھ حنفی کا لاحقہ برقرار رکھا ہے۔

شیخ ابوغدہ کے دلائل پر نقد کا جائزہ

اس کے بعد انھوں نے شیخ ابوغدہ کے دلائل کا رد کیا ہے، ہم بھی اس کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھیں گے اور دیکھیں گے کہ ان کا نقد کس حد تک قابل اعتبار اور لائق توجہ ہے۔

شیخ ابوغدہ نے ان کے حنفی ہونے کی تائید میں ان کے حنفیوں کے قاضی ہونے کی بات کہی ہے، اور یہ بات مشہور فقیہ طحطاوی نے کہی ہے، اس پر رد کرتے ہوئے محمد محمدی صاحب لکھتے ہیں :

و أما ما ذكره من أنه ولي قضاء الحنفية : فلم يرد في المصادر القديمة ، وانما ذكره السيد احمد الطحطاوي (ت:1231ھ) على ما نقله اللكنوي في الفوائد البهية عنه ، والطحطاوي لم يذكر مصادره في ذلك ۔ (۱)

کیا کسی بات کا قدیم مصادر میں نہ ہونا اس کے نفی کی دلیل ہے، جب کہ اُصول میں یہ بات واضح ہے کہ عدم ذکر ذکر عدم کی دلیل نہیں ہے،سوال یہ ہے کہ اس کی نفی پر محمد محمدی صاحب کے پاس کیا دلیل ہے؟ کوئی دلیل نہیں ہے؛لیکن چوں کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر یہ بات مان لی جائے کہ وہ حنفیوں کے قاضی رہے ہیں تو ان کے موقف کے خلاف ایک مضبوط شہادت مہیا ہوجائے گی؛ لہٰذا انھوں نے اس کے لئے قدیم مصادر میں عدم ذکر کا سہارا لیا ہے۔

ابن تیمیہ نے مختلف گروہوں اور فرقوں کے اقوال نقل کئے ہیں، اب وہ کتاب نہ ہمارے سامنے ہے اور نہ قدیم مصادر میں ان اقوال کا کوئی ذکر ملتا ہے تو کیا ہم ان اقوال کی نسبت ان گروہوں کی جانب غلط قرار دے دیں کہ قدیم کتابوں میں وہ موجود نہیں ہیں، یا پھر ہم یہ تسلیم کریں کہ ان کے سامنے ایسی کتابیں ہوں گی جن میں یہ اقوال مذکور ہوں گے اور وہ کتابیں یا تو نیست و نابود ہوگئی ہوں گی یا پھر ابھی تک طبع نہیں ہوئی؟

اسی طرح ہم یہاں بھی مانیں گے کہ علامہ طحطاوی کے پاس یقینا کوئی ایسا مصدر ہوگا،جس کی بنیاد پر انھوں نے یہ بات کہی ہے،ہاں اس کے برخلاف کوئی مضبوط شہادت سامنے آئے گی تو ہم اس سے دست بردار ہوجائیں گے ؛لیکن جب تک ایسا نہیں ہے تب تک اس بات کو تسلیم کرنا کہ وہ حنفیوں کے قاضی تھے ،علمی منہج اور طریقہ کار ہے۔

اس کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ تیمور لنگ کی ظلم وزیادتی اپنی جگہ؛لیکن وہ جس مقام سے تعلق رکھتا تھا وہاں زیادہ تر یا پورے کے پورے حنفی ہی تھے؛ لہٰذا ایسے میں انھوں نے علامہ تفتازانی کو جو صدر الصدور کا اہم عہدہ سونپا تھا، وہ اس کے لئے مزید ایک قرینہ ہے؛ کیوں کہ ہمارے علم میں نہیں ہے کہ اس نے کسی شافعی یا مالکی یا حنبلی عالم کو اپنی ریاست کا کوئی اہم عہدہ سونپا ہو،تکریم اور اعزاز الگ بات ہے،عہدہ ومنصب الگ چیز ہے بالخصوص صدر الصدور جیسا اہم عہدہ اور یہ بات تقریباً تمام سوانح نگاروں نے لکھی ہے کہ تیمور لنگ نے ان کو اپنی سلطنت کا صدر الصدور بنایا تھا۔

---

(۱) تبيين كذب المفتري فيما نسب إلى الأشعري: ۱/ ۲۹۸۔

شیخ عبدالفتاح نے ان کے حنفی ہونے کے دلائل میں سے ایک ان کی فقہ احناف میں لکھی گئی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے، اس پر محمد محمدی صاحب فرماتے ہیں :

یہ بات درست ہے کہ فقہ حنفی میں ان کی تصنیفات ہیں ؛ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے فقہ شافعی اور فقہ مالکی میں بھی تصنیف وتالیف کیا ہے ؛ لہٰذا اس سے استدلال درست نہیں ۔(۱)

فقہ شافعی میں ان کی لکھی گئی صرف ایک کتاب کا ذکر ملتا ہے اور وہ ''مفتاح'' ہے، اُصول فقہ میں ان کی علامہ ابن حاجب مالکی کی کتاب کی شرح کا ذکر ملتا ہے، اور یہ بھی صرف ایک ہی ہے، اس کے برخلاف فقہ احناف میں ان کی متعدد کتابیں ہیں، یہی تلویح ہے، ہدایہ کے خطبہ کی شرح ہے، سراجی کی شرح ہے، ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جس کا نام الفتاویٰ فی الفقہ الحنفیہ ہے، مختصر شرح تلخیص الجامع الکبیر ہے، اگر ان تمام کو فقہ شافعی میں لکھی گئی ایک کتاب اور اُصول فقہ مالکی میں لکھی گئی ایک کتاب سے موازنہ کیا جائے، جب بھی ان کا حنفی ہونا ہی راجح ہے ۔

آخر میں انھوں نے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی تلویح سے اقتباسات کو چند پوائنٹس پر رد کرنے کی کوشش ہے، ہم اس کا بھی جائزہ لیتے ہوئے چلیں گے :

من المعلوم ان التلويح شرح لكتاب التوضيح لمتن التنقيح لصدر الشريعة الحنفى ، وليس مما كتبه التفتازانى استقلالا ، ومما لايخفى ان الشرح يقتضى فى كثير من الاحيان مسايره المشروح ، لايضاح المسائل التى تعرض لها صاحب المتن ـ

پھر موصوف مزید لکھتے ہیں :

مع ماذكرت من ان الشرح يقتضى المسايرة فى كثير من الاحيان ، وان مااشاراليه الشيخ ابوغده هو من هذا الباب فكثير اما يتجنب التفتازانى حتى هذه المسايرة فيصرح بنسبة قول الاحناف اليهم ، دون اين ينتسب هو اليهم ، ولوكان حنفيا واضحا لم يكن هناك داعيا لذلک ـ

سوال یہ ہے کہ کیا یہ شرح لکھنے کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ مصنف اپنے مسلک کے برخلاف انتساب کرے، وہ شافعی ہو؛ لیکن جگہ جگہ خود کو حنفیوں کی جانب منسوب کرے، اگر وہ بقول محمدی صاحب بیشتر مواقع اور مواضع میں اس سے بچ سکتے ہیں تو چند مواقع پر اس سے کیوں نہیں بچ سکتے تھے؟

(۱) حوالۂ سابق: ۱/ ۲۹۸۔

پہلے تو وہ لکھتے ہیں کہ وہ چوں کہ متن کی شرح کر رہے تھے اس لئے مصنف کے ساتھ ہم قدم ہوتے ہوئے خود کو احناف کی جانب منسوب کر دیا، پھر دوسری لائن میں اس سے الگ موقف اختیار کرتے ہیں کہ انھوں نے بیشتر مواقع پر خود کو احناف کی جانب منسوب نہیں کیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ محمد محمدی صاحب کو خود احساس نہیں ہے کہ ان کے جملے کس قدر بے ربط ہیں؟ پھر یہ بھی کہ مصنف اگر حنفی ہو یا شافعی ہو یا مالکی وحنبلی ہو تو کیا ہر جگہ خود کو اپنے مسلک کی جانب منسوب کرتا ہے؟ یہ ایسی بات ہے جس سے فقہ کا متوسط درجے کا طالب علم بھی واقف ہوگا۔

مصنف نے اس کے بعد جو لکھا ہے، اس نے توضیح معنوں میں قلم توڑ کر رکھ دیا ہے :

ومما يعارض ذلك ايضا : كثرة ردود التفتازاني على الحنفية في هذا الكتاب نفسه والدفاع عن الشافعية وهذا مما اثار بعض الحنفية۔

اس اُصول پر تو نہ امام ابو یوسف حنفی ہوں گے نہ امام محمد حنفی ہوں گے اور نہ تمام اکابر فقہاء احناف جنھوں نے نقد ونظر سے کام لیا ہے، ابن ابی العزجن کے نام کے ساتھ ہمارے سلفی بھائی خاص طور پر ''حنفی'' کا لاحقہ لگانا نہیں بھولتے، وہ بھی حنفی نہیں ہوں گے، حضرت شاہ ولی اللہ بھی حنفی نہیں ہوں گے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی بھی اس فہرست سے خارج ہو جائیں گے، ایسی بچکانہ دلیلیں کوئی متوسط درجے کا طالب علم دے تو کسی حد تک برداشت کیا جاسکتا ہے، لیکن عقیدہ میں دکتوراہ کرنے والا کوئی فرد اس طرح کی دلیل دے تو اس سے دکتوراہ کے معیار کا بھی اندازہ ہوتا ہے :

ومن أوضح ما يعارض ذلك أن التفتازاني لوكان حنفيا لملا الكتاب بالانتساب إلى الحنفية ولكان حاله مثل حال صاحب الاصل صدر الشريعة الذي لا تخلو مسالة من المسائل الخلافية وإما اكثرها من انتسابه الى الحنفية۔

اس سوال یا اعتراض کا آسان سا جواب یہ ہے کہ جب ماتن اور اس کے شارح نے جگہ جگہ امام شافعیؒ یا شوافع حضرات کے بالمقابل عندنا کی تعبیر استعمال کی ہی ہے تو اب شرح کی شرح کرنے والے کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ جگہ جگہ خود کو احناف کی جانب منسوب کرے؟

ویسے اس پوری بحث میں چند سوال ایسے ہیں جن کا جواب محمد محمدی صاحب نے بالکل نہیں دیا ہے، یا اس سے تغافل عارفانہ برتا ہے :

(۱) اگر وہ شافعی ہیں تو فقہ شافعی پر ایک کتاب اور فقہ حنفی پر پانچ چھ کتابیں یا شرح کیوں لکھیں؟ ایسا تو ہمارے علم میں نہیں ہے کہ کوئی عالم کسی ایک مسلک کی جانب منسوب ہو اور پھر وہ اس مسلک سے زیادہ دوسرے مسلک کی کتاب لکھے یا دوسرے مسلک والوں کی کتاب کی شرح لکھے؟ اگر کچھ مثالیں ہوں تو محمد محمدی صاحب پیش کریں۔

(۲) محمد محمدی صاحب نے ہمیں امید ہے کہ ان کی تمام کتابوں کا بغائر مطالعہ کیا ہوگا، پھر حیرت ہے کہ ان کو ان کی فقہی کتابوں میں خود کو امام شافعی کی جانب منسوب کرنے والی کوئی عبارت کیوں نہیں ملی، اگر کسی کتاب میں نو مقامات پر ہی بقول محمدی صاحب علامہ تفتازانی کے احناف کے جانب منسوب کرنے کی عبارت ملتی ہے تو پھر اتنی بڑی کتاب میں ایسے بھی دس پندرہ مقامات تو چھوڑ یئے، چار پانچ مقامات تو ملنے چاہئے، جہاں انھوں نے خود کو شوافع حضرات کی جانب منسوب کیا ہو، اگر ان کو پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد بھی ایسی کوئی عبارت نہیں مل سکی تو پھر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کس موقف کا پلڑا بھاری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ :

(۱) علامہ سعدالدین تفتازانی جس علاقہ کے رہنے والے ہیں، وہ حنفیوں کا گڑھ رہا ہے، ایسے میں زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ حنفی ہی ہوں گے۔

(۲) ان کے والد قاضی تھے اور اس علاقے میں احناف کی موجودگی میں زیادہ امکان یہی ہے کہ آپ حنفیوں کے قاضی ہوں گے۔

(۳) علامہ سعدالدین تفتازانی خود احناف کے قاضی اور تیمور لنگ کی سلطنت میں صدرالصدور تھے، یہ بات بھی ان کی حنفیت کی موید ہے۔

(۴) انھوں نے بیشتر کتابیں فقہیات میں فقہ حنفی پر لکھیں یا حنفی فقہاء کی تالیفات کی شروحات لکھیں، اس سے بھی یہ واضح ہے کہ وہ حنفی ہی تھے۔

(۵) انھوں نے جگہ جگہ خود کو احناف کی جانب منسوب کیا ہے جو ان کے حنفی ہونے کی ایک قوی دلیل ہے، جب کہ اس کے بالمقابل ان کی کسی تحریر سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ شافعی تھے، یا انھوں نے کہیں خود کو حضرات شوافع کی جانب منسوب کیا ہو۔

اس تحریر کا مقصد مسلکی تعصب اور تحزب نہیں ہے ؛ بلکہ ایک علمی گرہ کو سلجھانا ہے اور اس بارے میں جو مغالطات ہیں ان کو واضح کرنا ہے اور بس، اب آخر میں ہم وہی کہنا چاہتے ہیں جو حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے فرمایا ہے کہ ''اس تحقیق کا مقصد مذہبی تعصب نہیں ہے ؛ بلکہ حقیقت کی نقاب کشائی ہے، علامہ تفتازانی کے شافعی ہونے سے ان کی قدر و قیمت میں کمی نہیں آئے گی اور نہ ان کے حنفی ہونے سے ان کی شان بڑھ جائے گی اور نہ اس کا برعکس ہے۔(۱)

---

(۱) اقامۃ الحجۃ،ص:۱۷/۱۸۔

ایک بے بنیاد الزام

علم کے نام پر جہل کی گرم بازاری عرب ملکوں میں بھی کم نہیں ہے، وہاں بھی ایسے ایسے مضحکہ خیز دکتور موجود ہیں، جن کے علمی کارنامے پڑھ کر ہنسی آتی ہے اور علم کے زوال پر رونا آتا ہے، علمی جہل کو بڑھانے میں مذہبی تعصب نے بھی بڑا کام کیا ہے، مذہبی تعصب کی وجہ سے مخالف علماء پر طعن وتشنیع، علمی گالیاں اور ان کو بے قدر وقیمت کرنے کی ہر ممکن کوشش پورے عروج پر ہے۔

علامہ سعدالدین تفتازانی کے حالات کی تلاش میں مختلف کتابوں کی ورق گردانی کرتے کرتے ''الموسوعة الميسرة في تراجم ائمة التفسير الاقراء والنحو واللغة'' تک پہنچا، اس کتاب میں مصنفین کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کا عقیدہ بھی بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، مصنفین کے عقائد ''وليد بن أحمد الحسين أبو عبد الله الزبيري'' نے تحریر کئے ہیں، ان صاحب کے نام کے ساتھ مدنی کا لاحقہ ہے، اب یہ مدینہ کی سکونت کی وجہ سے ہے یا پھر مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کی وجہ سے ہے، نہیں معلوم، اس کتاب میں علامہ تفتازانی کو ابن سینا اور فارابی کی بت پرستی سے ملحق کیا گیا ہے، ان کی عبارت دیکھئے :

> هذه الوثنية التفتازانية الكوثرية بعينها وثنية الفارابي وابن سينا الحنفي القرمطي ـ (۱)

اور اس وثنیت کی دلیل کیا ہے، وہ بھی ملاحظہ کیجئے :

> ولهذا ينتفع بزيارة القبور والاستعانة بنفوس الأخيار من الأموات في استنزال الخيرات واستدفاع الملمات فإن للنفس بعد المفارقة تعلقًا بالبدن وبالتربة التي دفن فيها ، فإذا زار الحي تلك التربة وتوجهت نفسه تلقاء نفس الميت حصل بين النفسين ملاقات وإفاضات ـ (۲)

اب آدمی سر نہ پیٹے تو کیا کرے، بہت سارے علماء اسلام بزرگان دین کی قبروں کے متبرک ہونے اور وہاں دعا قبول ہونے یا کسی اور قسم کے فائدہ کے قائل رہے ہیں، علامہ تفتازانی نے صرف اس کی توجیہ کی ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے وہ مقامات مقدس کیسے ہوتے ہیں اور وہاں سے فائدہ کیسے ہوتا ہے، اس واقعہ کی توجیہ کرنے والا

---

(۱) الموسوعة الميسرة في تراجم أئمة التفسير والإقراء والنحو واللغة: ۳/ ۲۶۴۳ـ

(۲) الموسوعة الميسرة في تراجم أئمة التفسير والإقراء والنحو واللغة: ۳/ ۲۶۴۳ـ

اگر وثنی ہے تو پھر جو اس کے قائل ہیں، وہ تو بڑے وثنی ہوں گے، زیادہ حوالہ جات سے تحریر طویل ہوجائے گی اور طویل تحریروں سے فی زمانہ لوگ اکتاتے ہیں، اس لئے صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں، امام ابن حبان جلیل القدر، محدث اور فقیہ ہیں، حدیث اور فقہ اور دیگر فنون اسلامیہ میں ان کی مہارت، رسوخ اور امامت مسلم ہے، وہ اپنے بارے میں فرماتے ہیں، ملاحظہ کیجئے :

> وما حلت بی شدة فی وقت مقامی بطوس فزرت قبر علی بن موسی الرضا (صلوات الله علی جده وعلیه) ودعوت الله إزالتها إلا واستجیب لی وزالت عنی تلک الشده ، وهذا شیء جربته مراراً فوجدته کذلک ، أماتنا الله علی محبة المصطفی وأهل بیته (صلی الله علیه وعلیهم أجمعین) ۔ (۱)
>
> طوس کے قیام کے دوران جب بھی مجھے کوئی مشکل درپیش ہوئی، میں نے حضرت علی بن موسی الرضا کی قبر کی زیارت کی، اور وہاں جا کر اللہ سے اس مصیبت کے دفع ہونے کی دُعا کی اور وہاں کی گئی میری دُعا ہمیشہ قبول ہوئی اور وہ مشکل ختم ہوئی، اس کو میں نے کئی مرتبہ آزمایا اور ہمیشہ میری دُعا وہاں پر قبول ہوئی، اللہ ہم سب کو حضور پاک ﷺ اور ان کے اہل بیت کی محبت پر موت عطا کرے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک مشہور محدث کسی جگہ کے بارے میں اعتقاد رکھتا ہے کہ وہاں دعا قبول ہوتی ہے جب کہ نصوص میں ایسا کچھ وارد نہیں ہے اور ایک شخص اس کی توجیہ بیان کرتا ہے تو اگر توجیہ بیان کرنے والا بت پرستی سے متہم ہے تو کسی خاص جگہ دعا قبول ہونے کا اعتقاد رکھنے والا بھی یقیناً بت پرستی سے متہم ہونا چاہئے ؛لیکن جو زبان تفتازانی کے حق میں بے لگام ہے، کیا وہ ابن حبان کو بت پرستی کا طعنہ دے گی، کبھی نہیں ؛ بلکہ اس کے لئے تاویل کے تمام حربے آزمائے جائیں گے، اس کے باوجود بھی انصاف کا دعویٰ کیا جائے گا، جیسا کہ اس کتاب کے مقدمہ میں کیا گیا ہے۔

ایک مزید غور کی بات یہ ہے کہ اس میں ابن سینا کو قرمطی اور حنفی کہا گیا ہے، یہ میرے محدود علم کے مطابق شاید پہلی مرتبہ ہے کہ کسی قرمطی کو حنفی کہا گیا ہے، شیعہ حضرات میں اور معتزلہ میں سے بعض تو فروعات کے لحاظ سے حنفی رہے ہیں ؛لیکن کوئی قرمطی حنفی رہا ہو، اس کی کوئی تاریخ اور شہادت نہیں ہے، اگر ہے تو اہل علم رہنمائی کریں۔

---

(۱) الثقات: ۸/ ۴۵۷۔

''ولید بن أحمد الحسین أبو عبد اللہ الزبیری'' نے علامہ تفتازانی کی ایک اور عبارت نقل کرکے اس پر مشہور سلفی عالم شمس افغانی کے حوالہ سے الحاد اور زندقہ کی سنگ باری کی ہے، عبارت ملاحظہ ہو :

أن نفي الجهة يعني علو اللہ علی خلقه هو الدین الحق ، ولکن الکتب السماویة والأحادیث النبویة جاءت خلاف هذا الدین الحق لأجل مصلحة العوام لأنه لو جاءت الکتب السماویة والأحادیث النبویة علی نفي الجهة لبادر هؤلاء العوام إلی العناد یسارعوا إلی الإنکار ۔ (۱)

اور اس پر یہ حاشیہ آرائی کی ہے :

ولا یخفی أن هذه المقالة غایة في الزندقة ونهایة في الإلحاد وهي عین تأویلات الباطنیة القرامطة ۔

کمال یہ ہے کہ دونوں جگہ حوالہ اصل کتاب کا نہیں، بلکہ شمس افغانی کی کتاب ''جهود علماء الحنفیة'' کا حوالہ ہے، اس سے مصنف کے علمی کمال اور نبوغ کا مزید اندازہ ہوتا ہے کہ اصل مصادر چھوڑ کر ثانی ماخذ پر اکتفاء کرلیا ہے، سوال ہے کہ یہ کہنا کہ قرآن قریم میں بعض باتیں بظاہر عوام کی رعایت کرتے ہوئے آئی ہیں، الحاد اور زندقہ کیسے ہے؟ خود قرآن کریم میں ہے کہ بعض باتیں متشابہات کے قبیل سے ہیں، جن کی مراد اللہ جانتا ہے اور راسخون فی العلم جانتے ہیں (اہل علم کی ایک بڑی تعداد کے قول کے مطابق)، خود اللہ کے رسول نے فرمایا ہے کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے، ایک جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ لوگوں کے عقل کا لحاظ کر کے بات کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول جھٹلائے جائیں، اس خود ساختہ مدنی عالم کی بات مانی جائے تو حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہ قول بھی الحاد وزندقہ ہے؟ کیوں کہ اس کا بھی مفاد وہی ہے جو کہ علامہ تفتازانی کے قول کا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کیلئے علو کی بحث چھوڑ دیجئے اور اس بنیادی نقطہ نظر کو سامنے رکھا جائے کہ قرآن وحدیث میں عوام الناس کا لحاظ کر کے باتیں کہی گئی ہیں اور بعض باتوں کو صراحت کے بجائے اشارے سے بیان کیا گیا ہے تو پھر تفتازانی کے قول اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول میں کوئی بنیادی فرق نہیں رہتا، اور اس کو زندقہ والحاد بتانا فکر ونظر کی کجی اور علم دین سے اپنی جہالت کو دنیا پر آشکار کردینا ہے۔

---

(۱) الثقات: ۸/ ۴۵۷۔

اسرار دین پر لکھنے والے چاہے غزالی ہوں، یا پھر ابن عبدالسلام ہوں، یا پھر شاہ ولی اللہ ہی کیوں نہ ہوں، سبھی نے اس کی صراحت کی ہے کہ علوم شرعیہ میں بالخصوص صفات الٰہی کے علم میں عوام اور خواص کی شریعت میں تفریق رکھی گئی ہے، بات اگر چہ عمومی طور پر کہی گئی ہے؛ لیکن اس میں ایسے اشارے رکھے گئے ہیں، جس سے خواص اپنی مراد کو پا سکتے ہیں، اگر یہ زندقہ ہے تو یہ سب بھی شاید من جملہ زنادقہ ہی ہوں گے؟ کیوں کہ انھوں نے عوام اور خواص کی تفریق کی ہے؟ جس کا من چاہے امام غزالی اور حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کو دیکھ کر جان سکتا ہے۔

ہم علم کے نام پر جہالت کے اس دور میں ہیں، جب خود رائی کا مرض عام ہے، نہ کسی کا احترام ملحوظ ہے اور نہ کسی کی علمی خدمات کا پاس ولحاظ ہے، جسے چاہے مشرک کہہ دیا، جسے چاہا قبر پرست بتا دیا اور جس پر چاہا الحاد وزندقہ کی تہمت لگا دی :

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

لکنت

علامہ تفتازانی کے سوانح نگاروں نے یہ واضح کیا ہے کہ ان کی زبان میں لکنت تھی: ''وَكَانَ فِي لِسَانه لكنة''۔(۱)

اور یہی بات طبقات المفسرین کے مصنف علامہ محمد بن علی الداؤدی المالکی نے (۲) میں اور علامہ خیر الدین زرکلی نے (۳) میں لکھی ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کو علامہ شریف جرجانی کے مقابلہ میں مناظرہ میں بظاہر ہار کا سامنا کرنا پڑا؛ کیوں کہ مناظرہ اور مباحثہ میں علم کے ساتھ ساتھ طلاقت لسانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے، یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص باوجود گہرے علم کے زبان پر عبور نہ ہونے اور اظہار مافی الضمیر پر پورے طور پر قادر نہ ہونے کی بنیاد پر سامعین کو متاثر نہ کرسکے اور نسبتاً اس سے کم تر علم کا حامل شخص فصاحت و بلاغت کی بنیاد پر بازی لے جائے اور سامعین کو متاثر کردے۔

علامہ تفتازانی کی ذات میں ان لوگوں کے لئے سبق ہے جو زبان کی تنگی سے شاکی ہیں، ان کو غور کرنا چاہئے کہ علامہ نے کس طرح زبان کی تنگی کی تلافی اپنے قلم سے کی اور صدیوں تک بہترین اذہان پر شرق تا غرب حکمرانی کی، آج کون جانتا ہے ہے خوش بیان واعظین اور سامعین پر جادو کرنے والے مقررین کو؛ لیکن علامہ کا نام زندہ ہے، ان کا کام زندہ ہے اور ان کی کتابیں پڑھ کر علم وفضل کی دولت حاصل کرنے والے زندہ ہیں۔

---

(۱) بغیۃ الوعاۃ:۲/۲۸۵۔ (۲) طبقات المفسرین للداوودی:۲/۳۱۹۔ (۳) الأعلام:۷/۲۱۹۔

انتقال

علامہ تفتازانی ان خوش نصیب لوگوں میں سے ایک تھے جنھوں نے وقت کے ایک ایک لمحہ کو کشید کیا، اس کو اپنے حق میں ذخیرہ آخرت اور دوسروں کے لئے دین ودنیا میں نفع بخش بنایا؛ لیکن موت کی اٹل حقیقت سے کسی کو مفر نہیں ہے، علامہ تفتازانی کی موت سمرقند میں ہوئی، اس پر تقریباً سبھی سوانح نگار متفق ہیں؛ لیکن تاریخ وفات میں چھ اقوال ہیں، ان میں سے دو قول زیادہ مشہور ہے ایک تو ۷۹۱ھ میں وفات کا قول، یہ قول مؤرخین کی ایک کثیر تعداد سے منقول ہے جس میں حافظ ابن حجر جیسے اساطین علم شامل ہیں، دوسرے ۷۹۲ھ اور اس میں بھی کئی معتبر نام ہیں، جیسے ان کے پوتے یحییٰ، علامہ طاش کبری زادہ، قاضی شوکانی، علامہ فرنگی محلی، نواب صدیق حسن خان وغیر ذلک، اور دلائل کے لحاظ سے موخر الذکر قول کو ترجیح ہے، اولا تو اس کے قائلین میں علامہ کے پوتے ہیں اور صاحب البیت ادریٰ بما فیہ، دوسرے اس قول کے قائلین میں علامہ کے بعض شاگرد ہیں اور استاد کے بارے میں شاگرد کو زیادہ علم ہوگا، تیسرے علامہ کی قبر پر یہی تاریخ وفات لکھی ہے اور ظاہری بات ہے کہ علامہ کے قبر پر تاریخ وفات ان کے گھر والوں نے لکھوایا ہوگا اور تازہ تازہ حادثہ رہا ہوگا؛ لہٰذا تاریخ میں بھی کوئی اشتباہ نہیں ہوگا۔

اولاد واحفاد

محمد بن مسعود

کتب تاریخ وتراجم میں آپ کے ایک بیٹے کا ذکر ملتا ہے، جن کا نام محمد تھا، علوم اسلامی میں آپ کو گہرا رُسوخ تھا، اور تیمور لنگ کے دربار سے آپ وابستہ تھے، اور سمرقند میں ہی آپ کا قیام تھا، جب تیمور کا انتقال ہو گیا تو آپ ہرات چلے آئے اور ہرات میں ہی ۸۳۸ھ میں طاعون کی بیماری میں آپ کا انتقال ہوا۔(۱)

یحییٰ بن محمد بن مسعود

علامہ تفتازانی کے ایک پوتے کا ذکر کتابوں میں ہے، جن کا نام یحییٰ تھا، آپ بڑے عالم دین تھے، آپ نے تیمور کے بیٹے شاہ رخ کے آخری دور سے لے کر مرزا سلطان حسین کا دور دیکھا، آپ اس دوران شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھے، علوم وفنون میں گہرا رسوخ تھا، طلبہ کے افادہ اور تدریس کی ذمہ داریوں کے ساتھ آپ قضا جیسے اہم منصب کے بھی ذمہ دار تھے، آپ نے نیک نامی کی زندگی گزاری، آپ کی بعض تصنیفات بھی ہیں، جیسے مفتاح الفقہ

---

(۱) التعلیقات السنیۃ علی فوائد البہیۃ: ۱۳۸۔

جوفقہ شافعی میں علامہ تفتازانی کی نامکمل تصنیف تھی، اس کو آپ نے مکمل کیا، اسی طرح کشاف کا ایک حاشیہ لکھا، جس میں علامہ جرجانی کے اعتراضات کے جواب پر خاص توجہ تھی، آپ کا انتقال سنہ ۸۸۷ ہجری میں ہوا۔(۱)

احمد بن محمد بن مسعود

علامہ سعدالدین تفتازانی کے پڑپوتے کا ذکر احمد کے نام سے کتابوں میں مذکور ہے اور پورا نسب نامہ اس طرح ہے، احمد بن یحییٰ بن محمد بن مسعود، آپ کا لقب سیف الدین تھا، تفسیر، حدیث، فقہ، اُصولِ فقہ، عربی زبان وادب، علم کلام، منطق اور دیگر فنون میں آپ یگانہ روزگار تھے، دُور دُور سے طلبہ آپ کے پاس آ کر اپنی علمی تشنگی بجھاتے، اور والد کے انتقال کے بعد ہرات کا منصب قضا آپ کو تفویض ہوا، آپ اس منصب پر ۳۰ سال فائز رہے، اور اس دوران تصنیف وتالیف اور طلبہ کو مستفید کرتے رہے، جب سنہ ۹۱۶ میں شاہ اسماعیل بن حیدر صفوی ہرات پر قابض ہوا تو اس نے دیگر علماء کے ساتھ آپ کو بھی قتل کر دیا، جس کی وجہ سے آپ کو شہید کہا جاتا ہے۔

آپ کی متعدد تصنیفات ہیں، جن میں سے کچھ کا ذکر کیا جاتا ہے :

(۱) الفوائد والفرائد۔

(۲) حاشیہ علی المطول۔

(۳) حاشیہ علی المختصر۔

(۴) حاشیہ علی التلوی۔

(۵) حاشیہ علی شرح الوقایۃ لصدر الشریعۃ۔

(۶) شرح تہذیب المنطق والکلام۔

(۷) شرح الفرائض السراجیۃ۔(۲)

(۸) تعلیقۃ علی اوائل الہدایۃ المرغینانی۔

(۹) حاشیۃ علی لوامع الاسرار شرح مطالع الانوار۔

(۱۰) حاشیہ علی وائل الکشاف۔(۳)

---

(۱) دیکھئے: التعلیقات السنیۃ: ۱۳۴، ہدیۃ العارفین ۲/ ۵۲۹، کشف الظنون ۲/ ۱۴۷۹، معجم المولفین: ۱۳/ ۲۲۸۔

(۲) حاشیہ علی شرح الجلال الدوانی علی العقائد العضدیۃ۔

(۳) دیکھئے: التعلیقات السنیۃ: ۱۲۷، ہدیۃ العارفین: ۱/ ۱۳۸، روضات الجنات: ۱/ ۳۴۲، معجم المولفین: ۲/ ۲۰۵، کشف الظنون: ۱/ ۴۷۵۔

ویسے حیرت کی بات ہے کہ بعض کتابوں میں آپ کو بھی آپ کے پرداد کی طرح شافعی کہا گیا ہے؛ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کی بھی فقہ شافعی میں صرف ایک کتاب اور فقہ حنفی میں کئی کتابوں کا ذکر ملتا ہے، جس سے گمان غالب یہ ہے کہ آپ بھی حنفی ہی ہوں گے؛ لیکن بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے آپ کو شافعیت کی جانب منسوب کر دیا گیا، جیسا کہ آپ کے پردادا کے ساتھ ہوا ہے، اس طرح پردادا اور پرپوتے میں ایک مشابہت نظر آتی ہے۔

● ● ●

مطالعہ کی سرگذشت

خالد سیف اللہ رحمانی

جواب نمبر : ۱

کسی بھی شخص کے لئے یہ متعین کرنا آسان نہیں کہ اس کے ذوقِ مطالعہ کا آغاز کب سے ہوا؟ کیوں کہ یہ ایک تدریجی اور ارتقائی عمل ہے، اور غیر محسوس اور غیر متعین طور پر اس کا آغاز ہوتا ہے، تاہم میری یادداشت کے مطابق اگر میں اپنے سفرِ مطالعہ کی داستان بیان کرنا چاہوں تو اس کا نقطۂ آغاز خود میرا گھر ہے، میرے دادا حضرت مولانا عبد الاحد صاحبؒ نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے بخاری شریف پڑھی تھی، اور دورہ حدیث کے امتحان میں تمام مضامین میں صد فیصد نمبرات حاصل کئے تھے، پھر دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بھی کسبِ فیض کیا، میرے والد صاحبؒ تنفس کے مرض کی وجہ سے دیوبند نہ جاسکے اور اپنے والد سے حدیث اور دوسرے مضامین کا درس لیا؛ لیکن وہ مطالعہ کے خوگر اور بہت ہی قوی الحفظ عالم دین اور طبیب تھے، میرے چچا حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ ماضی قریب کے مشاہیر علماء میں سے تھے، وہ حضرت مدنیؒ کے شاگردوں میں تھے، انھوں نے بھی دیوبند میں دورۂ حدیث کے مضامین میں صد فیصد نمبرات حاصل کئے تھے؛ اس لئے گھر میں علمی ماحول تھا، علمی مذاکرے ہوتے رہتے تھے، اور چھوٹا موٹا خاندانی کتب خانہ بھی تھا، جس میں منتخب عربی واسلامی علوم کی کتابیں موجود تھیں، میرے والد صاحب کو مطالعہ کا بڑا ذوق تھا؛ حالاں کہ ان کا ذریعہ معاش طبابت تھا؛ لیکن ان کا زیادہ وقت مطالعۂ کتب ہی میں گذرتا تھا، خاص کر تفسیر مدارک، سنن ترمذی اور مشکوٰۃ شریف کا بہت زیادہ مطالعہ کرتے تھے، میرا اندازہ ہے کہ کئی بار انھوں نے ان کتابوں کو بالاستیعاب پڑھا ہوگا، اس زمانہ میں ہمارے گاؤں میں بجلی کی سہولت نہیں تھی؛ لیکن یہ بات گویا میری والدہ مرحومہ کی واجبات میں تھی کہ مغرب سے پہلے آنگن میں بچھی ہوئی چار پائی پر چادر بچھادیں، تکیہ لگادیں اور سامنے ایک چھوٹے سی میز پر لالٹین جلادیں، جس کے شیشہ کو اچھی طرح صاف کیا جاتا، وہ مغرب کی نماز پڑھ کر تشریف لاتے اور چار پائی پر بیٹھ جاتے، پھر عشاء کی نماز کے وقفہ کے ساتھ کئی گھنٹہ مطالعہ کرتے، یہ روز کا معمول تھا، یہیں سے میرے ذہن میں مطالعہ کی اہمیت جاں گزیں ہوئی۔

خود قاضی صاحبؒ کو مطالعہ کا ایسا ذوق تھا کہ جب بھی گھر پر ہوتے یا تو لوگوں کے مسائل حل کرتے ، یا کتاب سامنے ہوتی ، اس دور میں ان کے اسفار بہت زیادہ ہوتے تھے ، زیادہ تر ٹرین سے ، کبھی کبھی جیپ سے ، یہاں تک کہ دیہات وقریہ جات کا سفر ٹائر گاڑی سے ہوتا تھا ، ان کی تقریر بہت ہی مؤثر اور دردمندانہ ہوتی تھی ، ایسا کم ہوتا تھا کہ ان کی تقریر ہو اور سامعین کے آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہوں ، لوگ ان سے بہت محبت کرتے تھے ، ان کے سفر کا سامان ہم لوگ تیار کرتے تھے ، جس میں ٹفن بکس اور بستر بند کے علاوہ ایک متوسط درجہ کا مضبوط تھیلا کتابوں کا ہوتا تھا ، ان کا پورا سفر مطالعہ میں گذرتا تھا اور جب سفر سے واپس آتے تو کتابوں کے اس تھیلے کے ساتھ ایک نئی خریدی ہوئی کتابوں کی تھیلی ساتھ آتی تھی ، جہاں کوئی اچھی کتاب نظر آجاتی تو خرید کئے بغیر ان کو چین نہ آتا تھا ، مطالعہ کا ایسا ذوق رکھنے والے لوگوں کے درمیان میں نے اپنی آنکھیں کھولی اور ان کی آغوش میں پرورش پائی ؛ اس لئے اسی زمانہ سے کچھ چھوٹی موٹی اُردو کی آسان کتابیں یا کہانیاں پڑھا کرتا تھا۔

میرے گھر کے پڑوس میں میرے رشتہ کی دادی کا مکان تھا ، جو کافی عمر رسیدہ تھیں اور تنہا رہتی تھیں ، میں بہت سی دفعہ اپنی کتاب لے کر ان کے گھر چلا جاتا تھا ؛ تاکہ یکسوئی کے ساتھ پڑھوں ، گھر پر رہتا تو والدہ مرحومہ کسی ضرورت سے بار بار دُکان بھیج دیتیں ، اس سے بچنے کے لئے ان کے گھر چلا جاتا ، اور ان سے کہتا کہ اگر کوئی میرے بارے میں پوچھنے کے لئے آئے تو آپ انھیں نہ بتائیں ، اس زمانہ میں جن کتابوں کا مطالعہ کیا ، ان میں سے دو کتابوں کے نام اب بھی ذہن میں محفوظ ہیں ، ایک کتاب کا نام تو یاد نہیں رہا ؛ لیکن اس کا موضوع شہادت حسینؓ تھا ، عجب نہیں کہ وہ کسی شیعہ عالم کی رہی ہو ، میں اسے پڑھ کر خوب روتا اور اگر کوئی آدمی آجاتا تو اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرتا ، دوسری کتاب کچھ اور شعور ہونے کے بعد پڑھی ، وہ مولانا مودودیؒ کی تصنیف ’’ پردہ ‘‘ تھی ، مجھے اس کتاب کا طرز تحریر اور طریقۂ استدلال بہت متاثر کرتا تھا ، جب میں جامعہ رحمانی مونگیر (بہار) میں داخل ہوا ، جو مشرقی ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ ہے ، تو وہاں اس ذوق کو اور جلا حاصل ہوئی ، وہاں کا کتب خانہ بڑا عمدہ تھا ، جو بانی ندوہ حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کا قائم کیا ہوا تھا ، اس کی عمارت بھی بہت خوبصورت تھی ؛ لیکن طلبہ کو اس سے براہ راست استفادہ کا موقع نہیں ملتا تھا ، میں بعض اساتذہ کے ذریعہ لائبریری سے کتابیں نکلواتا اور اس کا مطالعہ کرتا ، ایک آدھ کو چھوڑ کر یہ سب اُردو کتابیں ہوتیں۔

ایک دن جامعہ رحمانی کے موجودہ نگرانِ اعلیٰ امیر شریعت حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی دامت برکاتہم نے جو اس وقت استاذ تھے ، اور مجھے بھی ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہے ، اپنے ایک خطاب میں طلبہ کو ترغیب دی کہ آپ لوگ لائبریری سے استفادہ کریں اور جو کتاب پڑھنا چاہیں ، مجھ سے ملیں ، میں آپ کو نکلوا کر دوں گا ، میرے لئے یہ

اعلان مژدۂ جانفزا سے کم نہیں تھا، لائبریری میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی 'البلاغ' اور 'الہلال' کی فائلیں تھیں، میں نے مولانا کو درخواست دی کہ مجھ کو برائے مطالعہ یہ فائلیں چاہئیں، انھوں نے اجازت دے دی؛ لیکن چوں کہ لائبریری کے لئے الگ سے کوئی عملہ متعین نہیں تھا، اس لئے بڑی مشکل سے اس کی اجازت ملی کہ آپ لائبریری ہی میں بیٹھ کر مطالعہ کریں، اور یہ احتیاط واجبی بھی تھی؛ کیوں کہ یہ فائلیں قریب قریب بوسیدہ شکل میں تھیں، اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم، مولانا سید مناظر حسن گیلانیؒ، اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتابیں بہت ذوق وشوق سے پڑھتا تھا، مولانا مودودیؒ کی کتاب تو شہر میں موجود جماعتِ اسلامی کے مکتبہ سے مل جاتی تھی؛ لیکن بقیہ کتابوں کے لئے ہم پانچ ساتھیوں نے مل کر ایک سوسائٹی قائم کر لی تھی، ہر ماہ ہم پانچوں لوگ پانچ روپیہ جمع کرتے تھے اور پچیس روپیہ کی کتابیں آجایا کرتی تھیں، اور باری باری ایک ایک سیٹ سب کو مہیا ہوجاتا تھا، دس مہینوں میں خریدئ کتب کا دودور مکمل ہوجاتا تھا، پانچ روپئے اس زمانہ میں ہم لوگوں کے لئے کچھ کم نہیں تھے، ہر مہینہ ناشتہ کے لئے دس روپئے گھر سے آتے تھے، جس میں پانچ روپئے کتابوں میں چلے جاتے تھے اور بقیہ پانچ روپے دوسری ضروریات میں؛ اس لئے اکثر ناشتہ کا فاقہ ہوتا تھا۔

اس زمانہ میں جن کتابوں کو میں نے شوق سے پڑھا، ان میں علامہ شبلیؒ کی الغزالی اور علم الکلام بھی ہے، مجھ کو اس زمانہ میں نہ جانے کیوں معقولات سے کسی قدر دلچسپی پیدا ہوگئی تھی، مجھ سے نیچے کے طلبہ منطق وفلسفہ کی کتابیں مجھ سے درساً درساً پڑھتے تھے؛ چوں کہ علامہ شبلیؒ نے علم الکلام میں بعض ایسے مضامین بیان کئے ہیں، جو معقولی نوعیت کے ہیں، اس لئے مجھے اس سے دلچسپی ہوگئی؛ حالاں کہ وہ اس وقت میرے معیار سے اونچی کتاب تھی، ان کتابوں کے مطالعہ سے علامہ شبلیؒ کی دوسری کتابوں کو پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا اور الفاروق کا مطالعہ کیا، سیرت النبی میں علامہ شبلی کے عشق نبوی سے سرشار قلم نے ولادت باسعادت کی جو منظر کشی کی ہے، پوری طرح نہ سمجھ پانے کے باوجود میں اسے بار بار پڑھتا تھا اور سر دُھنتا تھا، اسی طرح علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ''خطبات مدراس'' کو پڑھا اور بار بار پڑھا، جامعیت سے متعلق بعض اقتباسات تو ازبر ہو گئے تھے۔

جامعہ رحمانی میں اگرچہ بہت اچھا کتب خانہ تھا، نہایت جید الاستعداد اساتذہ تھے، درس وتدریس میں مسابقت کا ماحول تھا؛ لیکن طلبہ کا عمومی مزاج اساتذہ کے درس کو سمجھنے اور پھر مذاکرہ کے ذریعہ اس کو اپنے ذہن میں راسخ کرنے تک محدود تھا، خارجی مطالعہ یا درسیات کی شروح کو دیکھنے کا زیادہ رجحان نہیں تھا، ہاں یہ ضرور تھا کہ اُردو شرح کو دیکھنے کو ایک عیب سمجھا جاتا تھا، اگر استاذ کے پاس کوئی اُردو شرح ہوتی تو وہ اس کو چھپا کر رکھتے تھے؛ اس لئے یہاں عربی ماٰخذ کے مطالعہ کا کوئی خاص ذوق پیدا نہیں ہو پاتا تھا، اس سے صرف دو چار مستثنیات ہیں، جیسے جب میں کافیہ

کے سال میں تھا تو مجھے استاذ نے تحریر سنبٹ اور ایسا غوجی دی کہ میں اس کا مطالعہ کروں، دورہ حدیث میں مسلم شریف ایک بہت ہی باکمال استاذ حضرت مولانا اکرام علی صاحبؒ کے پاس تھی، ہندوستان میں مسلم کا نسخہ شرح نووی کے ساتھ طبع ہوا ہے، وہ مجھے تاکید کرتے کہ میں روز کا روز نووی پڑھ کر درسگاہ میں آؤں، وہ گاہے گاہے میرا امتحان بھی لیتے تھے کہ کیا میں واقعی شرح نووی کا مطالعہ کررہا ہوں، اللہ کا شکر ہے کہ میں نے ان کے اعتماد کو قائم رکھا، اسی زمانہ میں مولانا آزادؒ اور مولانا مودودیؒ کی میں نے تقریباً تمام کتابیں پڑھ ڈالی، اس سے خاص طور پر تحریر کا سلیقہ پیدا ہوا۔

مونگیر سے فراغت کے بعد میں دیوبند گیا اور دوبارہ دورۂ حدیث کیا، دیوبند میں ہمیشہ سے مطالعہ کا بہت اچھا ذوق رہا ہے، وہاں مجھے مطالعہ کا ایک نیا اُفق ملا، میں نے شروع سال میں فتح الباری کا پورا مقدمہ حضرت مولانا اکرام علی صاحبؒ کے مشورہ سے تقریباً حرفاً حرفاً پڑھا، وہاں کتب خانہ کے ناظم مولانا محمد حنیف امروہویؒ تھے، ان کا حافظہ غضب کا تھا، اپنی زندگی میں قوتِ حفظ کے اعتبار سے جن دو تین شخصیتوں کو سب سے زیادہ فائق پایا، ان میں ایک وہ بھی تھے، وہ نیچے سے بیٹھے ہوئے بالائی الماریوں کی کتابوں کے بارے میں بتادیتے تھے کہ یہ فلاں خانہ میں فلاں جگہ پر ہے، اللہ نے ان کے دل میں میرے لئے بڑی شفقت ڈال دی تھی، جو کتابیں ناقابل اجراء تھیں، وہ بھی دیدیتے تھے، دیوبند میں دوپہر کا وقفہ کافی طویل ہوتا تھا، میری گذارش پر وہ مجھے کتب خانہ کے اندر چھوڑ دیتے تھے اور باہر سے مقفل کرکے چلے جاتے تھے، پھر جب واپس آتے تو کھول دیتے، اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائے، آمین۔

دارالعلوم میں میں نے متنوع موضوعات پر مطالعہ کیا، اسلامی علوم کا بھی، ادبیات کا بھی، عربی لٹریچر کا بھی اور اُردو کا بھی، دیوبند سے فراغت کے بعد میرے سرپرست و محسن امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے دو سال کے لئے مطالعہ و تحقیق کی غرض سے مجھے امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں رکھ دیا، جہاں ایک طرف میرے عم محترم حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ جیسا کثیر المطالعہ فاضل تھا تو دوسری طرف حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ جیسا مربی بھی تھا، وہاں دو صاحب دیوان شعراء بھی تھے: جناب اصغر امام فلسفیؒ اور جناب حاجی محمد شفیع صاحبؒ؛ اس لئے کثرت سے ادبی مجلسیں جما کرتی تھیں، قاضی صاحبؒ کی قیام گاہ ہی لائبریری تھی، جہاں عربی و اُردو کتابوں کا کافی بڑا ذخیرہ تھا، قضاء کے موضوع پر بھی کافی کتابیں تھی، اس لائبریری سے میں نے کافی استفادہ کیا اور قاضی صاحبؒ کی رہنمائی میں قضاء کے موضوع پر اچھا خاصا مطالعہ کا موقع لا، اس وقت تک بدائع الصنائع دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس زمانہ میں عام طور پر ہندوستان میں یہ کتاب دستیاب نہیں تھی؛ کیوں کہ ہندوستان میں طبع نہیں ہوئی تھی، جب اس کتاب کو میں نے پہلی بار پڑھنا شروع کیا تو اس قدر متاثر ہوا کہ اس کو الفاظ کے پیکر میں نہیں ڈھالا جاسکتا، میرا خیال ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت اپنے بزرگوں کی توجہ سے فقہی ذوق پیدا ہوا،

غالباً اس کا آغاز اسی کتاب کے مطالعہ سے ہوا، اس وقت ہندوستان میں مکمل شامی کے نسخے بھی نہیں ملتے تھے، قاضی صاحبؒ کے پاس حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے زیر مطالعہ رہنے والی شامی کا نسخہ تھا، طباعت بھی صاف ستھری تھی، اور اس پر جا بجا ان کے حواشی بھی تھے، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ میرے دادا کے ہم درس تھے؛ اس لئے قاضی صاحبؒ سے بڑی محبت فرماتے تھے، اور ان کو یہ نسخہ عنایت فرمایا تھا، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی فیض الباری کی طباعت غالباً ناشرین کے اختلاف کی وجہ سے اُن دنوں موقوف تھی، دارالعلوم دیوبند میں اس کا ایک پُرانا نسخہ تھا، اس کے اوراق بڑی احتیاط سے پلٹنا پڑتا تھا، جسے دو چار بار دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، یہاں اس کتاب کا نسخہ اچھی حالت میں تھا اور یہیں اس سے استفادہ کا موقع ملا، بہر حال یہ دو سالہ زندگی میرے مطالعہ کی نشوونما میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس کے بعد تو تدریس وتالیف کا دور شروع ہوا اور مطالعہ ایک شوق سے گذر کر ضرورت بن گیا۔

جواب نمبر : ۲

جن شخصیتوں کی صحبت سے مجھ میں مطالعہ کا ذوق پروان پڑھا، ان کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان میں درسیات کے مطالعہ میں حضرت مولانا اکرام علی صاحبؒ کی اور دوسرے موضوعات پر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ کی توجہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، مجھے اس کا کوئی موقع میسر نہیں آیا کہ کسی خاص رہنما کی رہنمائی میں تسلسل کے ساتھ مطالعہ کروں، تاہم ابتدائی مرحلہ میں تو کسی صاحبِ علم سے مشورہ ضرور ہی کرنا چاہئے؛ البتہ میرا خیال ہے کہ جب انسان میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا ذوق خود اس کی رہنمائی کرتا جاتا ہے، عقل وشعور کی منزل پر پہنچنے کے بعد بھی مطالعہ کے باب میں کسی رہنما پر مکمل انحصار سے انسان کا مطالعہ یکطرفہ ہو جاتا ہے اور انسان مطالعہ میں وسعت وتنوع سے محروم رہتا ہے، سوائے اس کے کہ کسی خاص موضوع پر مطالعہ کرنا ہو اور اس کے موضوع کے متخصص سے مشورہ لیا جائے۔

میرے مطالعہ کے جو مختلف ادوار ہیں اور جو ارتقائی تبدیلیاں ہیں، ان کا جواب سوال نمبر: ا میں آچکا ہے، ویسے میرا پسندیدہ موضوع حدیث، سیرت، فقہ اور شبہات حول الاسلام رہا ہے اور اُردو ادب کی کتابوں سے بھی کسی قدر دلچسپی رہی ہے۔

جواب نمبر : ۳

پسندیدہ مصنفین کے بارے میں بتلانا بہت دشوار ہوتا ہے؛ کیوں کہ مختلف ادوار میں انسان مختلف مصنفین

سے متاثر ہوتا ہے، تاہم تفسیر میں مجھے علامہ قرطبیؒ کی احکام القرآن، حدیث میں صحاحِ ستہ کے علاوہ امام طحاویؒ کی شرح معانی الآثار اور مشکلات الآثار بہت پسند ہے، حقیقت یہ ہے کہ حدیث میں امام طحاویؒ کا کام ایک مجتہدانہ کام ہے، جس سے احادیث میں دفع تعارض کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور اس کی اہمیت اس حقیر کی نظر میں فقہی اختلافات پر مبنی مباحث سے زیادہ ہے، کتبِ فقہ میں علامہ کاسانیؒ کے بدائع الصنائع اور علامہ ابن قدامہؒ کی المغنی مجھے بہت محبوب ہے اور اسلام کے مجموعی نظام حیات کے باہمی ارتباط اور احکام شریعت کے مصالح کو سمجھنے کے لئے امام غزالیؒ کی احیاء العلوم، علامہ عزالدین بن عبدالسلامؒ کی مصالح الاحکام اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغۃ، نہایت پسندیدہ کتابیں ہیں؛ حالاں کہ ان کتابوں کے بالاستیعاب مطالعہ کا موقع نہیں ملا؛ لیکن متفرق مقامات سے بار بار پڑھا ہے اور جب بھی پڑھا، دل ودماغ کو غذا حاصل ہوئی، اسی طرح اُصولِ فقہ میں علامہ قرافیؒ کی کتابیں، علامہ شاطبیؒ کی الموافقات اور اُصولِ فقہ کے شافعی منہج پر لکھی گئی کتاب الاحکام فی اُصول الاحکام للآمدی سے بہت فائدہ پہنچا، ان تالیفات کے واسطہ سے میرے محبوب مصنفین کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ان کے علاوہ اُردو مصنفین میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ بڑے محبوب مصنف ہیں، ایک زمانہ میں نیاز فتحپوری کی تحریر بھی پڑھنے لگا تھا اور ان کے اُسلوبِ تحریر سے بڑا متاثر ہوتا تھا؛ لیکن ایک بار والد مرحوم نے دیکھ لیا اور سختی سے منع کیا، اس کے بعد پھر کبھی نیاز فتحپوری کو ہاتھ نہیں لگایا، میں نے افسانے، ناول وغیرہ طرز کی تحریریں بہت کم پڑھی ہیں، تاہم ایک زمانہ میں گاہے گاہے بیسویں صدی پڑھ لیا کرتا تھا، اس کے افسانے بڑے مہذب اور سبق آموز ہوتے تھے، کرشن چندر کے بعض افسانے پڑھے، جو دل کو بہت بھائے؛ لیکن اب تو ان کے عنوان تک یاد نہیں رہے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا اداریہ ''سچی باتیں'' (صدق جدید) مولانا عثمان فارقلیطؒ کا اداریہ الجمعیۃ اور محمد مسلم صاحبؒ کا اداریہ 'دعوت' شوق سے پڑھتا تھا، اور اب بھی کبھی نظر آجاتا ہے تو اسی رغبت سے پڑھتا ہوں، طنز ومزاح کے پڑھنے کا ایک زمانہ تک بہت شوق رہا اور اس میں پطرس بخاری اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں نے زیادہ متاثر کیا، اگر منظوم مزاح گوئی کو بھی آپ اس میں شامل کرلیں تو اکبر الہ آبادیؒ کا بھی کوئی جواب ہوسکتا ہے؟

جواب نمبر : ۴

عام طور پر میں عصر سے شب کے بارہ بجے تک مطالعہ کرتا، یا تصنیف وتالیف کی خدمت انجام دیتا ہوں، آج بھی میرے مطالعہ کے اوقات اسی طرح قائم ہیں؛ البتہ 'قاموس الفقہ' کی تالیف کے زمانہ میں ہفتہ میں کئی دنوں رات کے تین بجے تک مطالعہ میں وقت گذرتا تھا، اب بھی کبھی کبھی شب کے ایک ڈیڑھ بجے تک مطالعہ کی توفیق مل جاتی ہے؛ لیکن ایسا کم ہوتا ہے، جہاں تک سفر میں مطالعہ کی بات ہے تو یہ تو میرے لئے مطالعہ کا سنہرا وقت ہوتا ہے،

سفر کی ضروریات کے علاوہ سفر کا پورا وقت مطالعہ میں گذرتا ہے، اور آج کل کاموں کے ہجوم کی وجہ سے یہ ایک طرح کی ضرورت ہوگئی ہے، اسی طرح رمضان المبارک بھی میرے لئے مطالعہ کے اعتبار سے بہت بابرکت وقت ہوتا ہے، ایک زمانہ میں تراویح کے وقت سے سحر تک مطالعہ اور تصنیفی کاموں میں مشغول رہتا تھا، اب اس میں فرق آ گیا ہے؛ لیکن پھر بھی یہ مہینہ سال بھر کی مطالعاتی اور تصنیفی کوتاہیوں کی تلافی کرتا ہے۔

جواب نمبر : ۵

نئے لکھنے والوں کے لئے میرا مشورہ ہے کہ :

الف : مطالعہ میں تسلسل ہونا چاہئے اور روز اس کے لئے دوسری مصروفیات کی طرح کچھ وقت متعین ہونا چاہئے، اس سے بڑی برکت ہوتی ہے، کتابوں کا انتخاب ابتدائی مرحلہ میں کسی صاحب قلم یا وسیع المطالعہ استاذ کی نگرانی میں کرنا چاہئے ، پھر جب خود دلچسپی پیدا ہوجائے تو اس کے ساتھ ساتھ اپنے ذوق سے بھی کام لینا چاہئے اور جس موضوع سے رغبت ہو، اسے مقدم رکھنا چاہئے۔

ب : مطالعہ جس کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں شامل نہیں ہے، اس کو مطالعہ کا کوئی محرک تلاش کرنا چاہئے، جیسے کسی موضوع پر لکھیں، خطاب کریں، مذاکرہ میں حصہ لیں، درس دیں، تو یہ سب چیزیں مطالعہ کا محرک بنتی ہیں، اس میں دلچسپی بھی پیدا ہوتی ہے اور مطالعہ ذہن میں محفوظ بھی رہتا ہے۔

ج : مطالعہ کے دوران جو اہم باتیں آئیں یا تو ان کو نشان زد کرلیا جائے، یا اس کی فہرست بنالی جائے تو بڑا نفع ہوتا ہے اور یہ عمل مطالعہ کو مستحضر رکھنے میں معاون ہوتا ہے۔

ہ : اسلامیات کا مطالعہ کرنے والوں کو چاہئے کہ ہر موضوع کی کم سے کم ایک کتاب ـــ چاہے وہ مختصر متن ہو ـــ بالاستیعاب اور توجہ کے ساتھ پڑھے، اس سے آئندہ کا مطالعہ آسان ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ انسان آسانی سے جب کسی بات کو سمجھتا ہے تو اس کو پڑھنے میں بھی دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

و : ہمارے روایتی علماء کے یہاں عام طور پر زبان و بیان کی خوبصورتی مفقود ہوتی ہے، تحریریں خشک اور سپاٹ ہوتی ہیں، بعض مضامین میں تو یہ ایک مجبوری ہے؛ لیکن ہر جگہ ایسا نہیں، اس سے جدید تعلیم یافتہ لوگوں اور عام پڑھے لکھے لوگوں میں ان کی تحریریں پڑھنے کی رغبت پیدا نہیں ہوتی؛ اس لئے اس پر ضرور توجہ دینی چاہئے اور زبان و بیان کے تعلق سے بعض مصنفین جیسے علامہ شبلی نعمانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ وغیرہ کو گاہے گاہے پڑھتے رہنا چاہئے۔

• • •

حضرت مولانا حبیب اللہ مدنیؒ

خالد سیف اللہ رحمانی

ہر دور میں کچھ ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں، جو فنا فی العلم ہوتی ہیں، جن کو کتابوں سے عشق کے درجہ میں محبت ہوتی ہے، تحقیق وجستجو کو وہ اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں، اور ان کی ہر گفتگو علم کے انوار بکھیرتی ہوئی نظر آتی ہیں، سلف کے دور میں تو ایسے اہل علم کی بڑی تعداد تھی؛ لیکن موجودہ دور میں بھی بعض ایسی شخصیتیں مل جاتی ہیں، ان ہی میں ایک حضرت مولانا حبیب اللہ قربان مظاہریؒ تھے، وہ خود ایک جوہر قابل تھے، اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی نگاہ کیمیا اثر نے ان کو مزید آبدار کر دیا تھا، ہندوستان کے ایک مردم خیز خطہ بہار کے ضلع چمپارن میں وہ پیدا ہوئے، سنہ پیدائش ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۳ء بتایا جاتا ہے، ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کی اور پھر حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی کشش انہیں کم عمری میں مظاہر علوم سہارن پور کھینچ لائی، یہاں انھوں نے اس وقت کے اکابر اساتذہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ، حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحبؒ اور حضرت مولانا سید محمد عاقل صاحب مدظلہ وغیرہ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

حضرت شیخ الحدیثؒ سے ان کو ایسا قرب حاصل ہوا کہ علوم ظاہری بھی ان سے حاصل کیا، علوم باطنی میں بھی ان سے مستفید ہوئے اور احسان وسلوک کی راہ میں بھی ان کے مجاز قرار پائے، سفر وحضر کے حاضر باش ہوئے، خطوط کی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی اور مزاج شناس ایسے ہو گئے کہ مضمون خط کا املا کرانے کے بجائے شیخ انہیں کو جواب لکھنے کا یا جواب کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا فرماتے تھے۔

کتابوں سے انہیں عشق تھا، اس حقیر کو دو تین بار ان کی خدمت میں حاضری کا اور ان کی دعوت طعام سے محظوظ ہونے کا موقع ملا ہے، ان کا کمرہ کچھ اس طرح تھا کہ گویا اینٹوں سے نہیں کتابوں سے دیواریں چنی گئی ہوں، وہ خود کتابیں خریدتے، دوست احباب اور اہل علم کو ہدیہ کرتے اور دینی مدارس کو بھی اس سے نوازتے، میرے علم کے مطابق مظاہر علوم وقف کو انھوں نے کافی کتابیں بھیجیں، اس حقیر کو بھی ملاقات کے وقت کچھ اہم کتابوں کا تحفہ

عنایت فرمایا، مطبوعات ار مخطوطات کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع تھیں، عالم عرب کے مکتبوں سے جو نئی کتاب شائع ہوتیں وہ ان کو جلد سے جلد حاصل کرنا چاہتے۔

یوں تو انہیں تمام ہی اسلامی علوم سے مناسبت تھی؛ لیکن علم حدیث سے ان کو خصوصی تعلق تھا، رجال سے متعلق بھی وہ برجستہ اور بروقت گفتگو کرتے تھے، مصنفین کے تسامحات کو واضح کرتے تھے، یہاں تک کہ اگر ان کے محبوب اساتذہ سے کوئی چوک ہوتی تو وہ احترام کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو واضح کرنے میں بھی تکلف سے کام نہیں لیتے تھے، حرمین شریفین کے بڑے بڑے علماء اور وہاں کی جامعات کے اساتذۂ حدیث استفادہ کے لئے ان کے پاس حاضر ہوتے اور دامنِ مراد بھر کر واپس ہوتے، حدیث کے علاوہ وہ فقہ حنفی بھی عرب طلبہ کو پڑھاتے تھے، جن میں حجاز ونجد کے علاوہ شام، مصر اور ترکی وغیرہ کے طلبہ بھی ہوتے تھے، مہمان نوازی کا بھی خاص ذوق تھا، میں جب بھی مدینہ حاضر ہوا اور ان کو حاضری کی اطلاع مل گئی تو خاص اہتمام سے دولت خانہ پر بلایا اور بعض عرب علماء کو بھی اس موقع پر مدعو فرمایا۔

ان کی علمی خدمات بھی خاصی وسیع ہیں؛ لیکن ان کے نام سے بہت کم چیزیں شائع ہوئی ہیں، انھوں نے حضرت مولانا سید محمد عاقل صاحب دامت برکاتہم کی ''**الحل المفهم على صحيح المسلم**'' اور ''**الفيض السمأوى على سنن النسائى**'' کی تالیف میں تعاون کیا، غالباً اس کام کے درمیان مولانا عاقل صاحب کا قیام بھی ان ہی کے دولت خانہ پر ہوا کرتا تھا، انھوں نے شیخ الحدیثؒ کے فضائل درود کا عربی میں ترجمہ کیا، ''لامع الدراری شرح البخاری'' پر بھی انھوں نے کام کیا، اور ''کشف الاستار عن زوائد البزار'' — جس پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کی تحقیق ہے — کی دو جلدوں کی بھی خدمت کی، اللہ کرے جلد یہ علمی جواہر پارے منظر عام پر آئیں، تاریخ مدینہ سے متعلق کتابوں پر مولانا کا کام ان کے تلمیذ رشید شیخ حسین شکری کے نام سے طبع ہو چکا ہے، اخیر زمانہ میں وہ بخاری پر انجام پانے والی کتابوں پر تحقیق کر رہے تھے، اور اس سلسلہ میں ان کے کام کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے بخاری کے متعلق لکھی گئی ۱۲۶ رکتابوں کا ذکر کیا ہے، اور مولانا عبدالسلام مبارکپوریؒ نے ۱۴۶ رکتابوں کا، مولانا نے حضرت شیخ الحدیث کی فہرست پر دو ہزار ناموں کا اضافہ فرمایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسی شخصیت تھے کہ ان جیسی شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں، انھوں نے اخیر تک مادر علمی سے اپنا رابطہ استوار رکھا اور اس کی نسبت کو اپنے لئے تمغۂ امتیاز سمجھا، وہ تعلیم حدیث کے سلسلہ میں عرب درسگاہوں کے طریقۂ کار سے مطمئن نہیں تھے، جن میں منتخبات پڑھادی جاتی ہیں؛ بلکہ ہندوستان میں صحاح ستہ کو

جس طرح بالاستیعاب پڑھایا جاتا ہے، اسی کو مفید سمجھتے تھے، مجھ سے انھوں نے ذکر کیا کہ ہمارے برصغیر میں حدیث کے طلبہ کے اندر جتنی استعداد پیدا ہو جاتی ہے، یہاں اساتذہ بھی اس درجہ کی استعداد سے محروم رہتے ہیں۔

یہ بھی مادر علمی سے تعلق کا ایک فطری اثر ہے کہ مظاہر علوم میں جو اختلاف کی شکل پیدا ہوئی اور اس کے دو حصے ہو گئے، وہ اس سے بہت رنجیدہ تھے، تاہم ان کا رجحان اپنے استاذ حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ مہتمم مظاہر علم وقف کی طرف تھا، آخر علم وتحقیق کا یہ چراغ اور حدیث کے جوئے شیریں کا یہ فرہاد ۱۹ / رجب ۱۴۴۱ھ کو سفر آخرت پر روانہ ہو گیا، اور اپنی آرزو کے مطابق جنت البقیع میں دفن ہونے کی سعادت سے سرفراز کیا گیا۔

● ● ●

اللہ کی امان اللہ کی امان میں!

خالد سیف اللہ رحمانی

ہر مدرسہ کی آغوش بہت سے مسافران منزل کو اپنے اندر جمع کر لیتی ہے، کسی کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ وہ خدمت دین کی راہ میں کہاں تک پہنچے گا؟ لیکن جب لوگ درسگاہوں کے احاطہ سے باہر نکلتے ہیں تو جوں جوں گمنامی کی گھٹائیں چھٹتی ہیں، مختلف افراد کا کام اور مقام دنیا پر واضح ہوتا ہے، کل جس کو ایک بے وقعت پودا سمجھا جاتا تھا، آج وہ ایک سایہ دار درخت بن جاتا ہے، کل جس کو کوئی ٹیڑھی آنکھ بھی دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا، آج وہ اپنی خدمات کی وجہ سے مرکز توجہ ہو جاتا ہے، اور پھر جب زندگی کے کسی مرحلہ پر ایک ہی درسگاہ میں بیٹھنے والے رفقاء ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں ہوتا، یہی حال میرا حضرت مولانا امان اللہ قاسمیؒ (کوکن) سے ملاقات کے وقت ہوا۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کیا، حضرت مولانا شریف حسین دیوبندیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سے بالترتیب بخاری شریف کی پہلی اور دوسری جلدیں پڑھیں، درس کا افتتاح بھی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے کرایا اور درس کا اختتام بھی، اس سال دورہ میں طلبہ کی تعداد کم وبیش چار سو تھی، اور خیال کیا جاتا تھا کہ اس سال طلبہ کی بہت بڑی تعداد دورۂ حدیث پڑھ رہی ہے، اس صورت حال میں ساتھیوں کی دید وشنید کی حد تک تو ملاقات ہوتی تھی؛ لیکن ایک دوسرے کے آشنا ہونے کی نوبت کم ہی آتی تھی، ہم دونوں کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا، پھر کافی عرصہ پہلے جب میں دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں استاذ تھا تو شعبۂ تخصص فی الفقہ میں جامعہ حسینیہ شری وردھن کے ایک طالب علم مولانا محمد عمر امبیڈکر فلاحی داخل ہوئے، یہ شعبہ چوں کہ مکمل طور پر راقم الحروف کے حوالہ تھا؛ اس لئے تمام طلبہ کے ساتھ ہمہ وقت ساتھ رہتا تھا اور طلبہ کافی قریب ہو جاتے تھے، ایسے ہی طلبہ میں ایک عزیز موصوف تھے، غریب خانہ پر بھی ان کی کثرت سے آمد ورفت ہوتی تھی اور میں ان کو املا کرایا کرتا تھا، ان سے عبارتیں بھی نکلوایا کرتا تھا، خاص کر فقہ شافعی کے متعلق؛ کیوں کہ وہ خود شافعی تھے، پھر جب وہ جامعہ حسینیہ شری وردھن میں مدرس ہوئے تو ان کی خواہش پر میں وہاں حاضر

ہوا، اور دو شخصیتوں کی ملاقات سے خاص طور پر بڑی مسرت ہوئی، ایک حضرت مولانا محمد ابراہیم خطیب دامت برکاتہم جو سادگی اور تواضع کا نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ ماشاءاللہ گہرے علم کے حامل ہیں، دوسرے: حضرت مولانا محمد امان اللہ قاسمیؒ، جو ہندوستان میں فقہ شافعی کی سب سے بڑی درسگاہ جامعہ حسینیہ کے مہتمم اور کوکن کی تمام دینی اور علمی سرگرمیوں کے نگران اعلیٰ تھے، جب آپس میں تعارف ہوا اور طالب علمی کا تذکرہ چھڑا تب معلوم ہوا کہ ہم دونوں ہم سبق ہیں، مولانا کے اخلاق، شرافتِ نفس، تواضع، رفقاء کی رعایت، معاملہ فہمی اور محبوبیت سے تو میں پہلے ہی متأثر ہو گیا تھا؛ لیکن ہم درس ہونے کی نسبت نے اُنس میں اور اضافہ کر دیا۔

مولانا کے حُسن اخلاق کا نقش یقیناً میرے قلب پر ثبت ہے، وہ سبق کے اعتبار سے ساتھی تھے؛ لیکن نشست و برخاست، گفتگو اور سلوک میں اس طرح پیش آتے تھے کہ گویا میرے شاگرد ہوں، میں ان کے سلوک سے شرمسار ہوتا تھا؛ لیکن ان کو اپنے حُسن اخلاق کی اس ادا سے نہ باز آنا تھا نہ باز آئے، ان کے اندر بڑی فعالیت اور حرکت تھی، کوکن کے متنوع علمی اور رفاہی کام کو ان کی سرپرستی حاصل تھی، ادارہ کے ذمہ دار کی عدم موجودگی میں اگر ادارہ کے کارکن کسی شخص کی تعریف کریں تو یہ اس کے لائق ہونے کی مضبوط دلیل ہوتی ہے، میں نے مولانا کے بارے میں یہی صورت حال دیکھی، ہر استاذ رطب اللسان اور ہر کارکن ثنا خواں، وہ ایک بڑے ادارہ کے ذمہ دار تھے؛ لیکن اس طرح اپنے آپ کو پیش کرتے تھے کہ گویا ایک چھوٹے موٹے ادارہ کے معمولی سے ذمہ دار ہوں، وہ اپنی قابلیت اور لوگوں کے درمیان مقبولیت کی وجہ سے بعد میں جمعیۃ العلماء کے نائب صدر بھی منتخب ہوئے، راقم الحروف کی دعوت پر المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں منعقد ہونے والے بعض پروگراموں میں بھی شرکت فرمائی؛ لیکن تواضع کا اتنا غلبہ تھا کہ بالکل آخری صف میں بیٹھتے اور اصرار کر کے ڈائس پر بلانا پڑتا، واقعہ ہے کہ انھوں نے حُسن انتظام اور حُسن اخلاق کو جمع کر لیا تھا؛ حالاں کہ یہ دونوں چیزیں بہت کم جمع ہو پاتی ہیں، وہ ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئے، حفظ اور عربی کی ابتدائی تعلیم جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں ہوئی، پھر متوسطات تا دورۂ حدیث دارالعلوم دیوبند سے کسب فیض کیا، ۱۹۷۸ء سے جامعہ حسینیہ شری وردھن میں تدریس وانتظام کی خدمت سپرد ہوئی اور آپ کی لیاقت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۸۳ء میں جامعہ ہذا کے مہتمم مقرر کئے گئے، میرے لئے وہ لمحہ بہت صدمہ انگیز تھا، جب مؤرخہ ۴؍ جولائی ۲۰۲۰ء کو ان کی وفات کی اطلاع ملی، میں نے اپنے دل میں کہا کہ آخر اللہ کی امان اللہ کی امان میں پہنچ گئی۔

• • •

حضرت مولانا عبدالوہاب خلجیؒ

خالد سیف اللہ رحمانی

حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کا ایک خاص مزاج یہ تھا کہ وہ ملت کے ہر پلیٹ فارم پر مسلمانوں کے تمام مسالک کو جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے؛ چنانچہ جب انھوں نے ''آل انڈیا ملی کونسل'' قائم کی تو مسلک اہل حدیث کی نمائندگی کے لئے جن حضرات کا انتخاب کیا، ان میں سب سے نمایاں نام حضرت مولانا عبدالوہاب خلجیؒ کا تھا، وہ ان کے بڑے قدرداں تھے، اور چوں کہ بیماری کی وجہ سے ان کا قیام دہلی میں ہوتا تھا اور وہیں مختلف ملی مسائل پر مشورہ کی مجلسیں بھی جمتی تھیں تو مولانا خلجیؒ ان مجلسوں کا لازمی جز سمجھے جاتے تھے، قاضی صاحبؒ ہی کے پاس پہلی بار اس حقیر کو ان سے ملاقات اور تعارف کا شرف حاصل ہوا۔

پھر جب قاضی صاحبؒ ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے صدر منتخب ہوئے تو انھوں نے جن شخصیتوں کو بورڈ میں شامل فرمایا، ان میں ایک نمایاں نام مولانا خلجی صاحبؒ کا ہے، وہ ان کے مشورہ کو بڑی اہمیت دیتے تھے، بعد میں وہ بورڈ کی مجلس عاملہ کے رکن بھی منتخب ہوئے، وہ بورڈ کے بہت ہی حاضر باش ارکان میں تھے، ایجنڈہ پر سوچ کر آتے تھے، قوت کے ساتھ اپنا مشورہ پیش کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ اجتماعی مشاورت میں کسی بھی شخص کی ہر رائے قابلِ قبول نہیں سمجھی جاتی؛ لیکن مولانا کی عالی ظرفی تھی کہ اگر ان کی رائے قبول نہیں کی جاتی، تب بھی ان کی پیشانی پر شکن نہیں آتی تھی، اور جو بات اجتماعی طور پر طئے ہو جاتی، وہ اس طرح اس کی وکالت کرتے کہ گویا یہی ان کی رائے ہے۔

وہ مسلک پر ملت کو غالب رکھتے تھے، اور اس کا خیال رکھتے تھے کہ اسلام دشمن عناصر باہمی مسلکی اختلاف کو اُمت میں تفریق کا ذریعہ نہ بنانے پائیں، اس کی بہترین مثال ایک مجلس کی تین طلاقوں کا مسئلہ ہے، یہ بات محتاج اظہار نہیں کہ اس میں فقہاء کے دو نقاط نظر رہے ہیں، ایک یہ کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہوتی ہیں، دوسرا یہ کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی مانی جائیں گی، ہندوستان میں اہل سنت کے تین مسالک ہیں: احناف، شوافع اور اہل حدیث، احناف اور شوافع کا نقطۂ نظر تین طلاقوں کے واقع ہو جانے کا ہے، اور اہل حدیث حضرات کے نزدیک

ایک طلاق واقع ہونے کا، حکومت اس اختلاف سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی، اور بظاہر اس کا جھکاؤ اس دوسرے نقطۂ نظر کی طرف تھا؛ لیکن اصل مقصد شریعت اسلامی پر حملہ کرنا اور اس میں مداخلت کا راستہ کھولنا تھا؛ لیکن اس موقع پر جماعت اہل حدیث نے یہ دانشمندانہ موقف اختیار کیا کہ اگر چہ ہمارے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف رائے ہے؛ لیکن ہم حکومت کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ہمارے شرعی مسائل میں مداخلت کرے، جماعت کے اس فیصلہ میں مولانا خلجی صاحبؒ کی آواز کا بڑا دخل تھا۔

انھوں نے ہندوستان کی اہم دینی درسگاہ ''جامعہ سلفیہ بنارس'' کے علاوہ مدینہ یونیورسیٹی سے بھی تعلیم حاصل کی، اردو اور عربی میں کئی کتابیں ان کی علمی یادگار ہیں، وہ جماعت اہل حدیث کے مشہور ہفت روزہ جریدہ ''ترجمان'' کے سولہ سال ایڈیٹر رہے، اپنی جماعت کے بہت سے عہدوں بشمول ناظم عمومی پر فائز ہوئے، اس کے علاوہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن عاملہ، آل انڈیا ملی کونسل کے معاون جنرل سکریٹری رہے اور دعوتی نقطۂ نظر سے مختلف ملکوں کے سفر کئے، اور اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں، یہ تو ان کی وفات کے بعد معلوم ہوا کہ وہ میرے ہم عمر بھی تھے، یعنی ان کی پیدائش ۱۹۵۶ء کی تھی، وہ ادھر عرصہ سے مختلف امراض کا شکار رہتے تھے، یہاں تک کہ ۱۳/اپریل ۲۰۱۸ء کو ان کی وفات ہوگئی، رحمۃ اللہ رحمۃ واسعہ۔

یہ ان کی تربیتی صلاحیت کا اثر ہے کہ ان کی اہلیہ مرحومہ حافظہ میمونہ ثروت صاحبہ بھی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی معزز رکن تھیں، اور ان کی صاحبزادی ڈاکٹر عالیہ نصرت خلجی بھی بورڈ کی رکن ہیں، نیز ان کی دوسری صاحبزادی ڈاکٹر عائشہ طلعت بھی دینی اور علمی میدان میں سرگرم سفر ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اُمت کو ان کی طرح وسیع النظر اور مجاہد صفت شخصیتیں عطا فرمائے۔

● ● ●

سفر نامہ ازبکستان

چند دن محدثین وفقہاء کی بارگاہ میں!

خالد سیف اللہ رحمانی

علوم اسلامی کا کون طالب علم ہوگا جس نے بخاریٰ وسمر قند، ترمذ وخرتنگ، خوارزم اور ماوراء النہر کا نام نہ سنا ہو، اور حسین خوابوں کی اس سرزمین میں پہنچنے کا آرزومند نہ ہو، یہ سارے علاقے اس وقت روس کے استبداد سے آزاد ہونے والی وسط ایشیائی جمہوریتوں میں سے ایک ازبکستان میں واقع ہیں، روسی قبضہ کے زمانہ میں کوئی پرندہ بھی یہاں حکومت کے منشاء کے خلاف پر نہیں مار سکتا تھا، اور خاص کر مسلمانوں کا اور علماء کا تو یہاں پہنچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا، جب روس کا اقتدار ختم ہوا تو بحمد اللہ یہاں آمد ورفت کا راستہ کھلا۔

دراصل اس خطہ میں ترکی نسل سے تعلق رکھنے والی پانچ ریاستیں ہیں، جو ایک ہی نسل کی مختلف شاخوں کی آبادیاں ہیں: ازبکستان، قازقستان، کرغزستان، ترکمانستان، آذربائیجان، یہاں جو زبانیں بولی جاتی ہیں، وہ بھی ترکی سے ملتی جلتی ہیں، اسی خطہ میں تاجکستان ہے، جہاں تاجک زبان بولی جاتی ہے، یہ فارسی سے قریب ہے، اور معلوم ہوا کہ نسلی اعتبار سے بھی وہاں کی بڑی آبادی فارسی النسل ہے، یہ ملک نہ صرف خود چاروں طرف سے خشکی سے گھرا ہوا ہے؛ بلکہ جن ممالک کے درمیان ہے، وہ بھی ساحلِ سمندر سے محروم ہیں؛ لیکن قدیم زمانہ سے اس علاقہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے؛ کیوں کہ شاہراہ ریشم جو چین اور یورپ کے درمیان تجارت کا راستہ تھا، یہیں سے گزرتی تھی۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہ علاقہ تین حکمرانوں میں منقسم تھا: خوارزم شاہ، چنگیز خان اور تیمور، قتیبہؒ بن مسلم نے (۸۷ھ — ۷۰۵ء ہیں) میں اس علاقہ کو فتح کیا اور بہ تدریج یہ خطہ دامن اسلام میں آ گیا، زار روس کے قبضہ سے پہلے یہ خطہ تین حصوں میں بٹا ہوا تھا: بخاریٰ، خوارزم، قہقان، تینوں ریاستوں میں حکومت مسلمانوں ہی کی تھی؛ لیکن الگ الگ قبائل کی، یہاں تک کہ ۱۸۶۰ء میں زار روس نے اِس پورے علاقہ پر قبضہ کرلیا، زار نے بھی کچھ کم ستم

نہیں ڈھائے؛ البتہ اس نے کمیونسٹوں کی طرح مذہب کے معاملہ میں دخل نہیں دیا، پھر جب روس میں کمیونسٹ اقتدار میں آئے تو انھوں نے ۱۹۱۷ء میں اس پورے خطہ پر اپنا قبضہ جمالیا، ابتداء میں مزاحمت کی گئی، اور بالخصوص علماء نے بڑی قربانیاں دیں؛ لیکن آخر اس نے اس طرح شکنجہ کسا کہ مسلمانوں کو آہ کرنے کا بھی یارا نہ رہا، اُس وقت روس ہتھیاروں کی کثرت کے لحاظ سے پہلے نمبر پر تھا اور اس کی فوجی طاقت نا قابل تسخیر سمجھی جاتی تھی، ان ملکوں کے لئے بہ ظاہر اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا؛ مگر ناامیدی اور مایوسی کی اسی تیرہ وتاریک شب میں خدا کی غیبی طاقت کا نور طلوع ہوا، جو افغانستان سے اُٹھا اور اُس نے روس جیسی طاقت کی پھیلائی ہوئی ظلمت کو پاش پاش کر دیا، آخر جب افغان مجاہدین نے اس سُپر طاقت کا غرور خاک میں ملا دیا اور اس نے وہاں سے رخت سفر باندھا تو بہت جلد وہ اِن ملکوں سے بھی واپسی پر مجبور ہوا، اور یہاں آزادی کا سورج طلوع ہوسکا، جیسے ہندوستان میں لوگوں کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرنی پڑی، یہاں ایسا نہیں ہوا؛ بلکہ اس کا سبب یہ ہوا کہ افغانستان کی جنگ سے روس کو فوجیوں اور ہتھیاروں کا جو نقصان ہوا، وہ تو ہوا ہی، معاشی اعتبار سے بھی اس کی کمر ٹوٹ گئی، اور اس کی مثال اس دیوہیکل درخت کی ہوگئی، جو اپنے آپ سوکھ کر گر گیا ہو۔

روسی دور اقتدار میں یوں تو ہر طبقہ متأثر ہوا، کمیونزم کے غیر فطری نظام کی وجہ سے محنت کشوں کا جذبۂ محنت سرد پڑ گیا، صنعت کاروں میں جذبۂ مسابقت باقی نہیں رہا، اس کی وجہ سے معاشی ترقی رک گئی، حکومت کی پوری توجہ اس غیر فطری نظام کو تقویت پہنچانے کے لئے فوجی طاقت میں اضافہ پر مرکوز ہوگئی، بین الاقوامی تجارت میں اس کا حصہ کم سے کم تر ہوتا گیا؛ لیکن اس سے سب سے زیادہ مذہبی طبقہ اور جمہوریت پسند گروہ متأثر ہوا؛ کیوں کہ کمیونزم کا خلاصہ یہی تھا کہ عوام دو کفِ جَو کے بدلے، اپنا ضمیر، اپنا عقیدہ، اپنی رائے اور اپنی زبان کو فروخت کر دیں، ازبکستان میں مردم شماری کے مطابق یوں تو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں؛ لیکن ان کی تعداد بہت مختصر ہے، اور روس کی مذہب دشمن حکومت کے مقابلہ ان کی طرف سے کوئی مزاحمت بھی نہیں ہوئی، جو کچھ ہوئی مسلمانوں کی طرف سے ہوئی؛ اس لئے مسلمانوں کی مذہبی شناخت مٹانے کی زیادہ کوشش کی گئی۔

اکابرِ محدثین وفقہاء سے منسوب اس پورے خطہ میں مدارس کی کثرت تھی، اور یہ درسگاہیں طالبان علوم نبوت سے معمور تھیں؛ لیکن سارے مدارس بند کر دیے گئے، بعض دوسرے کاموں کے لئے استعمال ہونے لگے، اور بعض منہدم کر دیے گئے، پورے ملک میں صرف ایک مدرسہ میر عرب باقی رکھا گیا، اور اس میں بھی اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچوں کو پڑھنے سے منع کر دیا گیا، تاشقند جیسے بڑے شہر میں صرف دو مسجدوں میں نماز کی اجازت دی گئی، وہ بھی صرف بوڑھے لوگوں کو، مسجدیں یا تو میوزیم اور مارکیٹ میں تبدیل کر دی گئیں، یا زمیں بوس کر دی گئیں،

پردہ پر سخت پابندی عائد کردی گئی، نہ قرآن مجید رکھنے کی اجازت تھی، نہ اسلام پر کوئی کتاب طبع کرنے کی، لوگوں کے پاس جو قدیم کتابیں تھیں، وہ ان کو چھپا چھپا کر رکھتے تھے۔

اس خطہ میں فارسی رسم الخط کا استعمال ہوتا تھا، ۱۹۲۵ء میں جبراً اس کو روسی رسم الخط میں تبدیل کر دیا گیا، پورے ملک میں کثرت سے محدثین، متکلمین، فقہاء اور صوفیاء کی قبریں ہیں، بہت سے مزارات بھی منہدم کر دیے گئے، اسکولوں میں کوئی دینی تعلیم نہیں دی جا سکتی تھی؛ البتہ ''آداب نامہ'' کے نام سے ایک مضمون شامل تھا، جس میں عمومی اخلاقیات کی تعلیم ہوتی تھی، روسی بڑی تعداد میں یہاں بسائے گئے، مسلمانوں سے ان کے ازدواجی رشتے بھی قائم ہوئے؛ بلکہ روسی عورت سے نکاح کو قابلِ افتخار سمجھا جاتا تھا، کمیونزم کے خلاف مزاحمت یا اسلام سے تعلق کی بناء پر جو لوگ شہید کئے گئے، وہ اتنے زیادہ تھے کہ ان کا کوئی شمار نہیں تھا۔

اس ماحول میں یہاں علماء نے جان کی بازی لگا کر جس حُسن تدبیر سے اسلام کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا، وہ تاریخِ دعوت وعزیمت کا ایک روشن باب ہے، لوگوں کو اسلام پر قائم رہنے کے لئے اپنی داڑھیاں منڈانا پڑیں، جوانوں کے لئے تو داڑھی کی اجازت بالکل نہ تھی، بوڑھوں کے لئے تھوڑی رعایت تھی، علماء نے حجروں کی خفیہ تعلیم کا نظام قائم کیا، زیر زمین حجرے بنائے جاتے، جو پہلے اس خطہ کی خانقاہوں میں ذاکرین کے لئے بنائے جاتے تھے، اس میں چُھپ چُھپا کر لوگ آتے اور قرآن مجید نیز اسلام کی بنیادی باتیں سیکھتے، بعض دفعہ پہلے حجرہ میں الماریوں میں شراب کی بوتلیں رکھی جاتیں؛ تاکہ پولیس پہنچے تو اسے شراب خانہ سمجھے، اور اندر کے حجرہ میں تعلیم دی جاتی، کبھی کھانے کی دعوت دی جاتی اور کھانے کے بہانے اپنے معتمد لوگوں کے سامنے اسلامی تعلیمات پیش کی جاتیں، جاسوس اتنے زیادہ تھے کہ ہر لمحہ خطرہ محسوس کیا جاتا، بعض اوقات شوہر و بیوی یا باپ بیٹا دونوں مسلمان ہوتے؛ مگر ایک دوسرے سے اپنا مسلمان ہونا چھپاتے، خوف و ہراس اور ظلم وجور کی اس فضاء میں علماء ومشائخ نے لوگوں کے ایمان کی حفاظت کا سروسامان کیا۔

۷۵ رسال کے طویل وقفہ میں ایسا لگتا تھا کہ اس سرزمین سے اسلام کا نام ونشان مٹ چکا ہوگا، مگر یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ جوں ہی روس کا جبری نظام ختم ہوا، مسلمانوں کے سینوں میں دبی ہوئی ایمان کی چنگاری پھر سے روشن ہوگئی، جو لوگ کمیونسٹ ہونے پر فخر کرتے تھے، یا تو خود انھوں نے کلمہ پڑھ لیا، یا ان کی نسلوں نے اشتراکیت کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکا، نوجوان عمومی طور پر اسلام کے سایہ میں واپس آگئے، جو روسی اس خطہ میں آباد کئے گئے تھے، ان میں بیشتر تو واپس ہوگئے، اور جو رہ گئے، وہ زیادہ تر مسلمان ہوگئے، فضاء میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ جو اپنے آپ کو ملحد کہتے تھے، وہ بھی کم سے کم زبانی طور پر خود کو مسلمان کہنے لگے۔

روس سے آزادی کے بعد ازبکستان کے پہلے صدر اسلام کریموف ہوئے، اگرچہ اسلام کی طرف ان کا زیادہ جھکاؤ نہیں تھا؛ لیکن ان کے دور میں سختیاں کچھ کم ہوگئیں، بہت سی مسجدیں بحال کی گئیں، مائک میں اذان کی اجازت ملی، ان کے بعد موجودہ صدر شوکت ضیائیف صدر منتخب ہوئے، ان کے عہد میں کافی سہولتیں پیدا کی گئی ہیں، بہت سی مسجدیں آباد ہوئی ہیں، بعض مسجدیں اور مقابر جو منہدم کر دیے گئے تھے، موجودہ حکومت نے دوبارہ پہلے ڈیزائن پر ہی ان کو تعمیر کرایا ہے، عوام کو خود مختار مدارس قائم کرنے کی اجازت تو نہیں ہے؛ لیکن حکومت کے زیر نگرانی اس وقت ملک بھر میں ۱۱ر مدارس چل رہے ہیں، جن میں تین وہاں کی اصطلاح میں ''عالیہ'' ہیں، یعنی وہاں سے طلبہ فارغ ہوتے ہیں، موجودہ فرمانروا کے اس طرز عمل سے عوام بہت خوش ہیں، اس خطہ میں آکر سب سے زیادہ جس چیز نے شاد کام کیا، وہ یہ کہ ماشاء اللہ ہر نماز میں مسجدیں آباد رہتی ہیں، اور بڑی حد تک نمازیوں سے پُر رہتی ہیں، نیز ممانعت کے باوجود ان میں غالب تعداد نوجوانوں کی ہوتی ہے۔

اِس وقت ملک کا دستور سیکولرزم پر مبنی ہے، یعنی حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے؛ لیکن عوام کے لئے ذاتی زندگی میں ایک حد تک مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہے، یکم ستمبر کو اس کا ''یوم استقلال'' قرار دیا گیا ہے، یعنی قومی دن کو یوم آزادی کی بجائے ''یوم خود مختاری'' کا نام دیا گیا ہے، ملک کا دستور زیادہ تر روس کے دستور سے ماخوذ ہے، یہاں بحیثیت مجموعی ۱۹ر مذاہب کے ماننے والے لوگ ہیں؛ لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے، ۳ر کروڑ ۳۰ر لاکھ کی آبادی میں ۹۶ر فیصد سے زیادہ مسلمان ہیں، سرکاری زبان اُزبک ہے؛ لیکن روسی زبان بھی کثرت سے بولی جاتی ہے، شہروں میں لوگوں کا معیار زندگی کافی اچھا ہے؛ لیکن دیہاتوں میں کافی غربت ہے، جہاں بہت سے مٹی کے کچے مکانات نظر آتے ہیں، روس نے یہاں کھیتوں کی سینچائی کا اچھا نظام بنایا ہے، اور زیادہ سے زیادہ زرعی اراضی تک پانی پہنچانے کی کوشش کی ہے، زمین میں کھلی نالیوں کے بجائے زمین کی سطح سے تقریباً دو فٹ اوپر اوپر پائپ کے ذریعہ نالیاں بنائی گئی ہیں، اور ان کو کھیتوں تک پہنچایا گیا ہے، شاید پانی کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ایسا کیا گیا ہے، سیرابی کا بنیادی ذریعہ دو دریا ہیں، ایک: دریائے آمور، جس کا پرانا نام دریائے جیحون ہے، دوسرا: دریائے سیحون، ملک کو کئی قدرتی وسائل بھی حاصل ہے، جن میں سونا، چاندی، نیچرل گیس، ہائیڈروجن گیس اور ملک کی ضرورت کے بقدر پٹرول اہم ہیں، کاٹن کی پیداوار کے اعتبار سے یہ دنیا کے چند گنے چنے ملکوں میں ہے؛ اسی لئے یہاں ٹیکسٹائل اور قالین کی صنعت کافی ترقی یافتہ ہے، لوگوں کا معیار زندگی تو بہت اچھا ہے؛ لیکن یہاں کی کرنسی جو ـــ سوم ـــ کہلاتی ہے، کی قیمت بہت ہی کم ہے، 9500 سوم ایک امریکی ڈالر کے برابر ہے، روس نے اس ملک کو جو فائدہ پہنچایا ہے، ان میں یہ ہے کہ سڑکیں کشادہ اور بہتر ہیں، لائٹ کا بہت اچھا نظم ہے، اور ملک کے ہر شہری کو ذاتی مکان حاصل ہے۔

اس ملک کی علمی تاریخ کی وجہ سے یہاں حاضری کی خواہش تو بہت عرصہ سے تھی؛ لیکن کچھ دنوں پہلے گجرات کے سفر میں دارالعلوم کھروڑ کے استاذ محب عزیز مولانا محمد ارشد صاحب سے ملاقات ہوگئی، اور کسی مناسبت سے بخاریٰ وسمرقند کا ذکر آ گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس ملک کا سفر کر چکے ہیں، میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ اگر رمضان المبارک کے بعد سفر کی کوئی صورت بنتی ہو تو میں بھی شریکِ سفر ہونا چاہوں گا، اسی دن اتفاق سے گفتگو میں ان ہی کے ہم نام عزیز مکرم مولانا محمد ارشد فلاحی سلمہ (استاذ فلاح دارین ترکیسر) بھی شامل ہو گئے، جو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے ابتدائی دور کے فضلاء میں ہیں، اور انھوں نے کہا کہ اگر آپ کا سفر ہو تو میں بھی آپ کے ساتھ رہوں گا، اور آپ کی خدمت کروں گا؛ البتہ مدرسہ کی ضرورت کے لحاظ سے ان کی رائے ہوئی کہ رمضان المبارک سے پہلے ہی یہ سفر ہو جائے، میں نے بھی حامی بھر لی، ازبکستان کی راجدھانی تاشقند میں ایک نوجوان فاضل مولانا عبدالقیوم صاحب ہیں، جن سے گذشتہ سفر میں مولانا ارشد کھروڑ کی ملاقات ہوئی تھی، انھوں نے جب ان سے میرے ارادہ کے بارے میں بتایا تو بہت خوش ہوئے، انھوں نے اس حقیر کی کتاب ''حدیث اور فقہ حنفی'' کا ازبک زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے، انھوں نے نہ صرف میری آمد پر اصرار کیا؛ بلکہ پورے سفر کے اخراجات اور انتظامات بہت ہی اصرار کے ساتھ اپنے ذمہ لے لیا۔

بالآخر ۱۰/ مارچ ۲۰۲۰ء کو راقم الحروف اور ارشدین عزیزین کا سہ نفری قافلہ ممبئی سے ازبکستان ایئر لائنز کے ذریعہ تاشقند کے لئے روانہ ہو گیا، ساڑھے تین گھنٹہ میں ہم لوگ تاشقند پہنچ گئے، تاشقند سے ۲۲۲/ کیلومیٹر پہلے برف کی دبیز چادروں سے ڈھکا ہوا پہاڑی سلسلہ نظر آیا، جو بڑا خوبصورت منظر تھا، ہم لوگ ایئر پورٹ سے اترے تو محب عزیز مولانا عبدالقیوم اپنے رفقاء کے ساتھ ایئر پورٹ پر موجود تھے، میزبان کی خواہش پر میں نے اپنی کچھ کتابیں ساتھ رکھ لی تھیں، اور مولانا ارشد کھروڈ نے مولانا عبدالقیوم کے آرڈر پر ان کے لئے کچھ کتابیں خریدی تھیں، دونوں ملا کر اچھی خاصی مقدار ہو گئی، کتابوں کے سلسلہ میں ایئر پورٹ کے عملہ کو کافی تأمل تھا؛ لیکن وضاحت کے بعد مسئلہ حل ہو گیا، اندازہ ہوا کہ مذہبی کتابوں کے سلسلہ میں ابھی بھی ان ملکوں کا رویہ کافی سخت یا محتاط ہے، ابھی صبح کا دس گیارہ ہی بجا تھا، ہم لوگ ہوٹل لے جائے گئے، وہیں ناشتہ کیا اور کچھ دیر آرام کے بعد شہر کے لئے نکلے، تاشقند وہی شہر ہے جو قدیم دور میں ''شاش'' کہلاتا تھا، شاش کے معنیٰ ترکی زبان میں پتھر اور چٹان کے ہیں، اور ''قند'' کے معنیٰ شہر کے ہیں، بعد کو یہ تاشقند کے نام سے معروف ہو گیا۔

تاشقند کی ایک شام

نظام یہ طے ہوا کہ بخاریٰ وسمرقند اور ترمذ کے بعد تاشقند کی سیر کی جائے؛ لیکن آج جو وقت بچا ہوا تھا، یہ بھی

استعمال میں آجائے؛ اس لئے ہم لوگ یہاں کی ایک قدیم درسگاہ مدرسہ کوکل داش جس کو آج کل ''گوگل داس'' کہا جاتا ہے، کی زیارت کے لئے پہنچے، اس کا شمار یہاں کے مدارس عالیہ میں ہوتا ہے، یہاں دوسو طلبہ زیر تعلیم ہیں، مدرسہ کے اندر جانے کا موقع نہیں ملا؛ کیوں کہ کسی بیرونی مہمان کو مدرسہ کے اندر جانے اور طلبہ سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس مدرسہ کی تعمیر عبداللہ خان کے زمانہ اقتدار میں ہوئی، ۱۵۵۷ء سے ۱۵۹۸ء تک ان کی حکومت تھی، یہ ۱۶۰ رکمروں پر مشتمل ہے، اور ۱۹۹۲ء میں اس کو ورلڈ ہیری ٹیج میں شامل کرلیا گیا ہے، اس مدرسہ کے سامنے ''مسجد کلاں'' ہے، یہ بڑی وسیع مسجد ہے، ہم لوگوں نے اسی میں مغرب کی نماز ادا کی، اسی کے قریب ''شور بازار'' ہے، جو یہاں کا قدیم اور وسیع مارکٹ ہے، ہر سامان کا الگ الگ حصہ ہے، ہر حصہ میں صرف اسی کی دکانیں ہیں، سفر کے آخری دنوں میں ہم لوگ اِس بازار میں بھی گئے، عصر کے بعد ہم لوگ تاشقند کے نئے شہر پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے لئے کار سے نکلے اور کافی دیر چلتے رہے، یہاں عام طور پر عمارتیں زیادہ اونچی نہیں ہیں اور یورپ کے انداز پر چھپر نما صورت میں بنی ہوئی ہیں؛ کیوں کہ ٹھنڈ کے موسم میں کافی برف باری ہوتی ہے، یہاں سڑکوں کو روشنی سے سجانے اور قمقموں کے جھالر لگانے کا بڑا رواج ہے، اور چوں کہ نیروز کا تہذیبی تہوار بھی قریب تھا؛ اس لئے لوگوں نے زیادہ اہتمام سے شہر کو سجا رکھا تھا، یہ بڑا خوبصورت منظر تھا، ایسا لگتا تھا کہ روشنی کی بارش ہو رہی ہے، مغرب بعد ہم لوگ مولانا اکرام صاحب کے یہاں واپس آئے، جو آج عشائیہ کے میزبان تھے، اکرام صاحب کے والد کا نام مولانا عبداللطیف خان تھا، جو ایک عالم تھے، ازبک زبان میں فارسی قواعد پر ان کی ایک کتاب بھی ہے، جو مدارس میں پڑھائی جاتی تھی، وہ خود بھی ایک مدرسہ عالیہ سے فارغ ہیں، یہاں کھانے پر مولانا حکمت اللہ صاحب بھی آگئے، جو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے شاگرد ہیں اور اچھی اردو بولتے ہیں۔

امام بخاریؒ کے قدموں میں!

۱۱ر مارچ کو ہم لوگ صبح ساڑھے سات بجے تاشقند سے روانہ ہوئے، اب ہماری منزل سمرقند تھی، سمرقند پہنچنے سے کچھ پہلے وہ مشہور جگہ ہے، جس کا ذکر خرتنگ کے نام سے تاریخ کی کتابوں میں آیا ہے، اب یہ سمرقند کا حصہ بن چکا ہے، امام بخاریؒ جب اہل بخاری کی ناقدری کی وجہ سے بخاری سے نکلے تو سمرقند کی طرف بڑھے، اور خرتنگ کے مقام پر ان کی وفات ہوگئی، یہیں امام بخاریؒ کی قبر ہے۔

یہ بھی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ناخوشگوار واقعہ ہے کہ بہت سے اہل علم کی نہ صرف یہ کہ قدر ومنزلت نہیں گئی؛ بلکہ ان کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی گئی، امام بخاری بھی انہیں لوگوں میں تھے، یہاں تک کہ ان کو اپنے شہر میں قبر

کے لئے دوگز زمین بھی نہیں مل پائی، یہ علماء اسلام کی استقامت کی ایک مثال بھی ہے کہ انھوں نے حکومت کے عتاب کا شکار ہونا تو گوارہ کیا اور ابتلاؤں اور آزمائشوں کی راہ میں آبلہ پائی کو قبول کر لیا؛لیکن دینِ حق کی تشریح واشاعت میں ادنیٰ درجہ کی بھی مداہنت گوارا نہیں فرمائی، اورحکومتِ وقت کے سامنے سر نہ جھکایا، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے پناہ رحمتیں نازل فرمائے، اور ہر دور کے اہل علم کو ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عزیمت کا راستہ اختیار کرنے کی توفیق میسر ہو، یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ امام بخاریؒ نسبی اعتبار سے نہ عرب تھے اور نہ ہاشمی ؛لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے حدیث کی ایسی خدمت لی کہ تمام عرب وعجم کی گردنیں ان کے سامنے خم ہیں، یہ اسلام کی آفاقیت اوراعجازی شان ہے کہ :

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

امام بخاری کی قبر پر ایک بہت ہی خوبصورت اور عالیشان عمارت بنی ہوئی ہے، جو مرجع خلائق ہے؛لیکن یہاں کے دوسرے مقبروں کی طرح یہاں بھی یہ بات دیکھنے میں آئی کہ لوگ قبر پر آتے ہیں، فاتحہ پڑھتے ہیں، اورواپس چلے جاتے ہیں، قبر پر سجدہ کرنے ،مرادیں مانگنے کا یا اپنی مرادوں کی پرچیاں باندھنے کا اس طرح کا رواج نہیں ہے، جو برصغیر میں ہے، ہم لوگ مزار کے حجرے کے اندر کچھ دیر بیٹھے، مولانا محمد ارشد فلاحی ،مولانا محمد ارشد کھروڑ اور مولانا عبدالقیوم تاشقندی —سلمہم اللہ تعالیٰ— بھی موجود تھے، ان حضرات نے خواہش کی کہ صحیح بخاری کی چند احادیث پڑھ کر اِن حضرات کو خود امام بخاریؒ کی قبر کے پاس حدیث کی اجازت دی جائے؛ چنانچہ مولانا ارشد فلاحی نے بخاری کی ابتدائی حدیث پڑھی ،مولانا ارشد کھروڑ اور مولانا عبدالقیوم نے آخری حدیث اوراس حقیر نے اول وآخر دونوں حدیثیں پڑھیں اور اِن حضرات کو اجازت دی، بالخصوص میری وہ سندیں جو حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور حضرت مولانا عبدالرشید نعمانیؒ کے واسطہ سے ہیں، اور جن میں اس حقیر کے اورحضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے درمیان صرف تین واسطے ہیں، کی اجازت دی گئی، اوراللہ تعالیٰ کی توفیق سے کچھ سورتوں کی تلاوت کر کے امام بخاریؒ کے لئے دعاء کی گئی، امام صاحبؒ کی ممنونیت کا احساس دل پر چھایا رہا، اورغیر معمولی مسرت ہوئی کہ بخاری شریف ہم لوگوں نے پڑھی، اللہ نے پڑھانے کی بھی توفیق عطا فرمائی؛لیکن آج خود امام بخاریؒ کے قدموں میں پہنچنے کی سعادت حاصل ہوئی، امام بخاریؒ کی قبر کا احاطہ بہت وسیع ہے،حکومت نے سیاحتی نقطۂ نظر سے پورے احاطہ کی اوراس کی عمارتوں کی بہت تزئین کی ہے؛اس لئے یہ شکوہ اورفنی نزاکت کا حسین امتزاج ہے۔

یہاں ''المعہد العالی لدراسات الحدیث النبوی امام بخاریؒ'' کی عمارت بھی حکومت نے بنائی ہے جو حدیث کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ہے، وہاں بھی جانا ہوا، معہد عالی میں یہ چھٹی کا وقت تھا؛ لیکن اساتذہ کو جب اطلاع ملی تو انھوں نے پرتپاک استقبال کیا، ابھی طلبہ کی تعداد محدود ہے، صرف بارہ طلبہ رہتے ہیں، طلبہ بھی بڑی محبت وعقیدت کے ساتھ ملے، یہ معہد یہاں کے تین معاہد میں سے ایک ہے، اور حکومت کے زیر انتظام ہے، یہاں مولانا عبدالقیوم نے راقم الحروف کی کچھ کتابیں لائبریری میں جمع کرائیں، ادارہ کا نصاب بھی دیکھا، نصاب اچھا ہے، میں نے مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ کی بعض کتابوں کا مشورہ دیا، معلوم ہوا کہ یہ پہلے سے شاملِ نصاب ہیں، حدیث کے علاوہ دوسرے علوم کی کچھ کتابیں بھی نصاب کا حصہ ہیں، اس نصاب کی ترتیب میں حکومت نے مختلف اہل علم کو دعوت دی تھی، جن میں عالم عرب سے شیخ یوسف القرضاوی کے علاوہ ہندوستان سے حضرت مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی (صدر شعبہ حدیث: دارالعلوم دیوبند) اور پاکستان سے حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی بھی شامل تھے۔

اس احاطہ میں قرآن مجید کا میوزیم بھی ہے، جس میں دنیا بھر سے قرآن مجید کے نسخے جمع کئے گئے ہیں، یہ اس پہلو سے بہت اہم ہے کہ جہاں لوگوں کو گھر میں قرآن رکھنے کی بھی ممانعت تھی، جن لوگوں کے پاس قرآن مجید تھا، وہ اس کے ایک ایک ورق کو تبرک کے طور پر چھپا کر رکھا کرتے تھے، اور اگر برصغیر سے کوئی صاحبِ علم یا دیندار شخص پہنچتا تو ان سے کہتے تھے کہ آپ مجھے کوئی اور چیز نہ دیجئے، صرف قرآن مجید کا کوئی ورق ہو تو دے دیجئے، آج وہاں ماشاء اللہ قرآن مجید کے نسخوں کا میوزیم بنا ہوا ہے، لوگ آتے ہیں اور قرآن مجید کے مختلف نسخوں کی زیارت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ مستقبل میں اس سرزمین کا رشتہ ہمیشہ قرآن سے قائم رکھے اور اُس کو اس کی عظمت رفتہ واپس مل جائے۔

یہیں ایک صاحب کے یہاں دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا، انھوں نے بڑی محبت کے ساتھ ہمارے پورے قافلہ کے لئے پُرتکلف کھانے کا انتظام کیا تھا، عصر کی نماز پڑھ کر ان کے یہاں سے ہم لوگ حضرت قُثَم ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کی زیارت کے لئے گئے، یہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، بہت بچپن میں ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل ہوئی تھی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو اپنے زمانہ خلافت میں مدینہ کا گورنر بنا دیا تھا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد وہ اِس طرف آ گئے، یہیں ان کی شہادت ہوئی، شاید اسی لئے ان کو یہاں ''شاہ زندہ'' کہا جاتا ہے، اہل سیر نے لکھا ہے کہ شکل وصورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت مشابہ تھے، یہ قبر بہت اونچائی پر ہے، کافی سیڑھیاں چڑھ کر قبر تک پہنچنا ہوتا ہے، ہمارے دونوں احباب نے تو ہمت کی اور وہاں تک پہنچے؛ لیکن مجھے اونچائی کی وجہ سے ہمت نہیں ہوئی، میں نے

نیچے ہی سے فاتحہ پڑھ لیا، ان حضرات نے بھی واپسی کے بعد بتایا کہ آپ کا ارادہ نہ کرنا ہی بہتر ہوا، بہر حال یہ بات قابل توجہ ہے کہ اسلام کی تعلیم واشاعت کے لئے صحابہؓ کہاں کہاں پہنچے؟ جب کہ اُس وقت موجودہ دور کے وسائل نہیں تھے، پھر بھی انھوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے ایسی جدوجہد کی کہ پوری دنیا تک اسلام کی روشنی پہنچادی۔

سمرقند میں ایک دن

سمر کے معنی ازبکی زبان میں قلعہ کے اور قند کے معنیٰ زمین اور شہر کے ہیں؛ چوں کہ اس شہر میں کثرت سے قلعہ نما عمارتیں بنائی گئی ہیں، غالباً اسی لئے اس کو سمرقند کا نام دیا گیا، کچھ لوگوں نے لکھا ہے کہ یہ ''گھرک کند'' تھا، جس کے معنیٰ ''نیلے شہر'' کے ہیں، شاید اسی لئے یہاں کثرت سے نیلے گنبد مختلف تعمیرات کا حصہ ہیں، مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی اس شہر کے حسن وجمال کی تعریف کی ہے، یہ دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہے، یونیسکو کے ریکارڈ کے مطابق یہ 2750 سال قدیم شہر ہے، جس کا قدیم نام ''اسارا'' تھا، قتیبہ بن مسلم باہلی نے ۸۷ھ مطابق ۷۰۵ء میں اس شہر کو فتح کیا، پھر اس کا قبضہ ہاتھ سے نکل گیا تو دوبارہ سن ۹۲ھ میں فتح کیا، اس شہر کے لوگوں کے دامن اسلام میں آنے کی تاریخ بہت دلچسپ بھی ہے سرمایۂ عبرت بھی، جب قتیبہ نے اس شہر کو فتح کیا تو یہاں عیسائیت کا بول بالا تھا، جو شہر کا سب سے بڑا کاہن تھا، اس نے قاضی شہر کے پاس قتیبہ کے خلاف دعویٰ دائر کیا کہ اس کی فوج نے شہر کو تہہ وبالا کر کے رکھ دیا ہے؛ لیکن نہ ہمیں اسلام کی دعوت دی گئی اور نہ ہمیں غور کرنے کی مہلت دی گئی، قاضی نے جب قتیبہ سے جواب طلب کیا تو انھوں نے کہا کہ جنگ تو چالبازی کا نام ہے، یہ تو بڑا شہر ہے، اس کے قرب وجوار میں جو شہر ہیں، وہ مقابلہ ہی پر اڑے رہے، نہ مسلمان ہونا قبول کیا، اور نہ جزیہ دینا؛ اس لئے مجھے ان کے اسلام قبول کرنے کی امید نہیں تھی، قاضی نے پوچھا: کیا تم نے ان کو اسلام یا جزیہ کی دعوت دی تھی؟ قتیبہ نے کہا: نہیں، قاضی صاحب نے کہا، پھر تو تم نے مدعی کے دعویٰ کا اقرار کر لیا، قاضی نے قتیبہ سے کہا: اللہ نے اس امت کی انصاف قائم کرنے اور دھوکہ سے بچنے کی وجہ سے مدد کی ہے: مانصر اللہ ھذہ الامۃ إلا بالدین وإقامۃ العدل؛ چنانچہ مدعی کے حق میں فیصلہ ہوا کہ تمام مسلمان چاہے وہ سرکاری افسر ہوں یا فوجی، مرد ہوں، عورتیں ہوں یا بچے، سب کے سب شہر خالی کر دیں، دوکانات ومکانات کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں، اور سمرقند میں کوئی مسلمان نہ رہے، کاہنوں کے لئے یہ بات ناقابل یقین تھی؛ مگر اس کا اعلان کر دیا گیا اور رات ہونے سے پہلے پہلے سارے لوگ شہر سے باہر نکل گئے، سورج ڈوبنے کے بعد سمرقند کے ویران راستوں پر کتے بھونکنے لگے، اور مسلمانوں جیسی رحم دل قوم کے شہر سے چلے جانے پر لوگوں کو اتنا صدمہ ہوا کہ ہر گھر سے آہ وبکا کی آوازیں آنے لگیں، یہاں تک کہ کاہنوں کا گروہ بھی اس کو

گوارہ نہ کر سکا، اور سمر قند کے لوگ فوج درفوج اس حال میں مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی کی طرف بڑھے کہ بڑا کاہن آگے آگے تھا اور لوگوں کا جم غفیر پیچھے پیچھے، سب کی زبانوں پر کلمۂ شہادت تھا، شاید ہی تاریخ میں ایسی مثال ملے کہ فاتح کے اخلاق سے متأثر ہو کر مقدمہ اپنے حق میں فیصل ہونے کے باوجود ایک پوری قوم نے فاتح گروہ کا مذہب قبول کرلیا ہو، افسوس کہ مسلمان فاتحین نے اس بات پر کم توجہ دی کہ زمینیں تو فولادی تلوار سے فتح کی جاتی ہیں؛ لیکن دل ودماغ اخلاق کی تلوار سے فتح کئے جاتے ہیں۔

یوں تو سمر قند اپنے موسم اور قدرتی حُسن کی وجہ سے ہمیشہ ہی حکمرانوں کا مرکز توجہ رہا ہے؛ لیکن جب تیمور نے اس شہر کو اپنی وسیع وعریض سلطنت کا دارالخلافہ بنا دیا تو اس کے بعد اس کی رونق کو چار چاند لگ گئے، پُرشکوہ خوبصورت تعمیرات بھی ہوئیں، تیمور نے دور دور سے صنعت کاروں اور فنی ماہرین کو بھی یہاں لا کر بسایا، ان کی مدد سے بہترین عمارتیں بھی بنائی گئیں اور قالین سازی اور بعض دوسری صنعتوں کو بھی یہاں فروغ ہوا، ہندوستان کے مغل فاتح بابر کی پیدائش تو فرغانہ میں ہوئی؛ لیکن ایک درجہ میں اس کا تعلق بھی سمر قند سے تھا، اس کا نسب باپ کی طرف سے تیمور سے اور ماں کی طرف سے چنگیز خاں سے ملتا تھا، وہ افغانستان سے گذر کر درۂ خیبر کی طرف سے ہندوستان پہنچا، اور یہاں ایسی مستحکم حکومت کی بنیاد رکھی جو تقریباً چار سو سال قائم رہی۔

سمر قند میں بہت سے اہل علم گذرے ہیں، ان میں ایک ممتاز نام علامہ ابو بکر سمر قندیؒ کا بھی ہے، جن کی کتاب ''تحفۃ الفقہاء'' فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے؛ لیکن اُن کی قبر یہاں نہیں ہے، علم کلام کے ایک بڑے امام ابوالمنصور ماتریدیؒ (م: ۳۳۳ھ) ہیں، عام طور پر حنفیہ کے یہاں اعتقادات میں ان ہی کی اتباع کی جاتی ہے اور معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان ان کی رائے کو ایک معتدل رائے سمجھا جاتا ہے، ان کی نسبت سمر قند کے محلہ ''ماترید'' کی طرف ہے، ''مأخذ الشرع، تاویلات اہل السنہ اور شرح فقہ اکبر'' ان کی مشہور تالیفات ہیں، ان کی قبر یہیں واقع ہے، ہم لوگ وہاں پہنچے، ان کا مقبرہ بہت ہی خوبصورت ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کے گنبد کے اندرونی حصے میں سونے کے کام میں بیس پچیس کلو سونا استعمال کیا گیا تھا؛ لیکن روسیوں نے ان سب کو کھرچ کر نکال لیا، ابھی بھی چار پانچ کیلو سونا گنبد کی اندرونی سطح میں موجود ہے، اور نظر بھی آتا ہے، یہاں بھی فاتحہ پڑھنے کی توفیق ہوئی اور دعاء کا اہتمام کیا گیا۔

اس کے بازو میں ایک قبرستان ہے، جو ''قبرستانِ محمدین'' کہلاتا ہے، اس قبرستان میں ان لوگوں کو دفن کیا جاتا تھا، جو تفسیر وحدیث اور فقہ وکلام میں نمایاں مقام رکھتے تھے، اور ان کا نام ''محمد'' تھا، کہا جاتا ہے کہ تقریباً چار سو ایسے اہل علم اس قبرستان میں مدفون ہیں؛ البتہ قبریں نمایاں نہیں ہیں اور نہ صاحب قبر کی شناخت موجود ہے، یہاں

بھی حاضری اور ایصال ثواب کا موقع ملا، اس قبرستان سے باہر تھوڑے ہی فاصلے پر صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین مرغینانیؒ (م: ۵۹۳ھ) کی قبر ہے، علامہ مرغینانیؒ کا نام چوں کہ محمد نہیں تھا؛ اس لئے اس قبرستان میں ان کو جگہ نہیں ملی؛ لیکن اس قبرستان کے باہر قریب ہی میں دفن کئے گئے، احاطہ سے باہر کہاں دفن کئے گئے؟ اس کی نشان دہی متعین طور پر موجود نہیں ہے؛ مگر تخمینہ کے طور پر ان سے منسوب ایک رمزی قبر بنادی گئی ہے، بہر حال ایصال ثواب کے لئے خاص قبر کے پاس ہی کھڑا ہونا تو ضروری نہیں؛ چنانچہ ہم لوگوں نے وہیں سے دعاء اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا۔

''سمرقند'' کا لفظ آتے ہی ایک اہم نام امام ابواللیث نصر بن محمد سمرقندیؒ (م: ۳۷۳ھ) کا ذہن میں آتا ہے، ان کا شمار بڑے فقہاء میں ہے، فقہائے احناف میں ان کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہے، مسائل میں ان کی ترجیحات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، جدید اجتہادات پر ان کی مشہور کتاب ''نوازل ابواللیث سمرقندی'' ہے، ان کی تفسیر ''تفسیر السمر قندی'' بھی ایک بلند پایہ تفسیر شمار کی گئی ہے، یہ بھی سمرقند ہی میں مدفون ہیں، یہاں بھی ہم لوگوں کو پہنچنے کی سعادت حاصل ہوئی، اور فاتحہ پڑھنے کا موقع ملا، ان کے مزار کا احاطہ بہت بڑا ہے، اور حکومت نے اس کو بہت ہی خوبصورت بنایا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، یہیں ایک اور بزرگ خواجہ ناصر الدین عبیداللہ احرارؒ (م: ۸۹۵ھ) کی قبر بھی ہے، جو اپنے زمانہ کے بڑے نقشبندی بزرگ تھے، ملا عبدالرحمن جامیؒ بھی آپ کے خلفاء میں ہیں، یہاں بھی حاضری کا موقع ملا، حسب معمول دعاء کی گئی، مغرب کا وقت ہو چکا تھا اور ہم لوگوں کو معروف محدث علامہ دارمیؒ کی قبر پر بھی جانا تھا؛ اس لئے وہاں سے جلد روانہ ہونا پڑا، راستے میں ''مسجد لائق'' کے نام سے ایک مسجد ملی، مغرب کی نماز یہاں ادا کی گئی، ہمارے میزبان نے اس مقام کے کسی ذمہ دار شخص سے ہم لوگوں کی آمد کا ذکر کر دیا تھا، وہ سارے لوگ انتظار میں چشم براہ تھے؛ حالاں کہ مغرب کا وقت شروع ہوئے کچھ دیر ہو گئی تھی؛ لیکن انھوں نے انتظار کیا اور جب ہم لوگ پہنچے تو نماز ہوئی، نماز کے بعد تمام حاضرین نے مصافحہ کیا اور خواہش کی کہ دعاء کرائی جائے؛ چنانچہ اس حقیر نے دعاء کرائی، حاضرین بڑی عقیدت ومحبت کے ساتھ کچھ اس طرح پیش آئے، گویا برسوں کی ملاقات ہو، اللہ تعالیٰ ان حضرات کو بہترین اجر عطا فرمائے۔

اس سے کچھ فاصلے پر مشہور محدث علامہ عبداللہ بن عبدالرحمن دارمیؒ (م: ۲۵۵ھ) کی قبر ہے، یہ علاقہ دیہات کا ہے، رات کا اندھیرا اچھا خاصا ہو چکا تھا، ہم لوگ وہاں پہنچے، اور گاڑی کی روشنی جلا کر قبر کے قریب آئے، فاتحہ پڑھ کر آگے بڑھے، علامہ دارمیؒ کا علم حدیث میں بڑا اونچا مقام ہے، امام مسلم، ترمذی اور ابوداؤد وغیرہ نے

ان سے حدیث لی ہے، اور بعض لوگوں نے ان کی ''سنن'' (فقہی ترتیب پر حدیث کا مجموعہ) کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے؛ اس لئے یہاں آمد سے بڑی روحانی مسرت حاصل ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ سمرقند خوبصورت عمارتوں کا ایک حسین گلدستہ ہے، اور ہر عمارت اپنی جگہ فن تعمیر کا شاہکار ہے؛ چوں کہ امیر تیمور نے یہاں تعمیری کام ایرانی ماہرین سے کرایا تھا؛ اس لئے ڈیزائن کے اعتبار سے جیسے برصغیر میں دہلی، آگرہ اور لاہور کی مغلیہ عمارتوں کے درمیان مماثلت پائی جاتی ہے، اسی طرح یہاں کی عمارتیں بھی کثرت میں وحدت کا منظر پیش کرتی ہیں، یوں تو سمرقند میں بہت سی عالی شان مسجدیں ہین اور ہر مسجد ایسی ہے کہ ''دامن دل می کشد کہ جا این جاست''، لیکن ''مسجد بی بی خانم'' کو اپنی وسعت، طرز تعمیر اور خوبصورتی کے اعتبار سے نمایاں حیثیت حاصل ہے، یہ امیر تیمور کی سب سے بڑی بیوی ''بی بی خانم'' سے منسوب ہے، اس کے سامنے امیر تیمور کا بی بی خانم کے لئے بنوایا ہوا محل بھی ہے، یہ عمارتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، الفاظ میں اس کا نقشہ نہیں کھینچا جا سکتا۔

یہاں کی ایک بہت ہی مشہور اور تاریخی جگہ میدان ریگستان ہے، اسی کو بعض عرب مصنفین نے میدان داجستان لکھا ہے، آج کل اس کو ''ریگستان اسکوائر'' بھی کہتے ہیں، امیر تیمور اپنی فتوحات کے بعد اسی میدان میں اپنی فاتحانہ یادگاروں کی نمائش کرتا تھا، اس میدان کے ایک طرف شارع عام ہے، اور تین طرف تین مدارس کی عالی شان عمارتیں ہیں، دائیں جانب مدرسہ شیر دار ہے، جس میں معقولات کی تعلیم دی جاتی تھی، یہ سلطنت بخاریٰ کے نائب امیر اور ازبک کمانڈر شیر دار نے تعمیر کرایا ہے، ۱۴۱۹ء میں اس کی تعمیر عمل میں آئی، بائیں جانب مدرسہ اُلغ بیگ ہے، جو ۱۴۱۷ء میں تعمیر ہوا، الغ بیگ تیمور کا پوتا تھا، اور اس کا شمار ماہرین فلکیات میں ہوتا تھا، اس نے اپنے ذوق کے مطابق ایک رسدگاہ بھی تعمیر کرائی تھی، جس کے نقشہ کا لاطینی ترجمہ آکسفورڈ سے شائع ہوا ہے، یہ مدرسہ اس نے سائنسی مضامین کی تعلیم کے لئے بنایا تھا، اس نے امتحان کے بعد ایک ایسے سادہ لباس درویش کو اس کی ذمہ داری سونپی، جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، اور پاؤں میں جوتا تک نہیں تھا؛ لیکن اس نے اُلغ بیگ جیسے ماہر فن کے سوالات کا بروقت جواب دیا، یہ درویش تھے: مولانا محمد حوافی، وہ زندگی بھر اس جامعہ کے امیر رہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ ادوار میں کس طرح مسلمان علماء دینی وعصری علوم کا بہترین امتزاج ہوا کرتے تھے!

درمیان میں مدرسہ طِلا کاری ہے، اس کو بھی شیر دار خان نے ۱۶۴۶ء میں بنوایا تھا، مدرسہ کے اندر ایک مسجد ہے، جس کی اندرونی دیواروں اور چھت پر سونے کی نقاشی کی گئی ہے؛ اس لئے اس مسجد کو ''طلائی مسجد'' اور مدرسہ کو ''مدرسہ طِلا کاری'' کہا جاتا ہے، اس خطہ کے اکثر گنبدوں کی طرح اس مسجد کے اوپر بھی نیلے رنگ کا ایک بلند گنبد

ہے اور دونوں طرف نیلے رنگ کی برجیاں بنی ہوئی ہیں، اس مدرسہ کو خاص طور پر علوم شرعیہ کی تعلیم کے لئے تعمیر کیا گیا تھا، ان تینوں عمارتوں کے درمیان کھلا ہوا نہایت کشادہ صحن ہے، آج کل یہاں روشنی اور آواز پروگرام بھی پیش کیا جاتا ہے اور ملک کی قومی تقریبات اسی میدان میں منعقد کی جاتی ہیں، یہ تینوں عمارتیں اپنی شان وشوکت، بلندی اور دیواروں کے خوبصورت نقش ونگار کے اعتبار سے ایک سے ایک ہیں۔

میدانِ ریگستان سے متصل امیر تیمور کا مجسمہ ہے، جس میں وہ گھوڑے پر سوار ہے، اس کے نیچے اس کی قبر ہے، وہ ۱۳۳۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۴۰۵ء میں اس کی وفات ہوئی، ترک منگول کی برلاس شاخ سے اس کا تعلق تھا، ایک ہی زمانہ کے دو طاقت ور اور جابر حکمراں تیمور اور چنگیز کا جد امجد تومنہ خان تھا، تیمور نے اپنی زندگی میں ۴۲ رملک فتح کئے، اس کی فتوحات کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۳۹۸ء میں وہ ہندوستان پہنچا اور دہلی میں قتل عام کرایا، اور ۱۳۹۹ء میں دمشق اور حلب کو فتح کیا، اس کی شجاعت جس قدر قابل تعریف ہے، اس کی خوں آشامی اسی قدر قابل مذمت، اور مسلمان اور حافظ قرآن ہونے کے باوجود اِس میں مسلم وغیر مسلم کا کوئی فرق نہیں تھا، یہ جنگ میں بہ یک وقت دونوں ہاتھ استعمال کرتا تھا، دائیں ہاتھ میں تلوار رکھتا تھا اور بائیں ہاتھ میں کلہاڑی، اور اس کے ساتھ ساتھ گھوڑے کی لگام بھی ہاتھ میں ہوتی تھی، ان مہمات میں زخم کھا کھا کر دایاں ہاتھ شل اور دائیں پاؤں میں لنگ ہو گیا؛ اسی لئے مخالفین ان کو ''تیمور لنگ'' کہتے تھے؛ لیکن ازبکستان میں اس کو ہیرو کا درجہ دیا جاتا ہے اور ''امیر تیمور'' کہا جاتا ہے۔

بہر حال آج کا پورا دن سمرقند کی سیر میں گزرا، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے پورا شہر دیکھ لیا؛ لیکن کچھ اہم اور یادگار عمارتیں ضرور دیکھ لیں، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ علمی دنیا پر جن محدثین اور فقہاء کا ایسا احسان ہے کہ امت کبھی اس سے سبک بار نہیں ہو سکتی، ان کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، یہیں ایک ریسٹورنٹ میں میزبانوں کی طرف سے ہم لوگوں کے لئے عشائیہ کا نظم تھا، جب ہم لوگ ہوٹل واپس آئے تو معہد امام بخاریؒ کے دو اساتذہ بھی ملاقات کے لئے آئے، جن میں ایک مولانا نظام الدین تھے، جو ہدایہ اور شرح معانی الآثار پڑھاتے ہیں، دوسرے مکتبہ کے ذمہ دار تھے، ماشاء اللہ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان حضرات کے اندر دیوبند کی بڑی محبت ہے، اور اس حقیر سے ان کی محبت ایک تو اس کی تالیفات کی وجہ سے ہے؛ لیکن ساتھ ہی ایک اہم سبب دیوبند کی نسبت بھی ہے۔

اس سفر میں ہم تینوں اور مولانا عبد القیوم کے علاوہ ایک اہم ساتھی تاشقند کے ایک تاجر جناب مظفر صاحب بھی تھے، ان ہی کی گاڑی تھی اور وہی ڈرائیونگ کر رہے تھے، ان کے علاوہ جناب احمد نقشبندی کے لڑکے عبد الرحمٰن

حافظ اور ایک صالح نوجوان ''آبی جان'' بھی تھے، جو مولانا عبدالقیوم کے شاگرد ہیں اور حفظ کر رہے ہیں، جناب بختیار صاحب، جناب سعید اعظم صاحب، جناب فیض اللہ صاحب اور دیگر محبت کرنے والوں کا بھی ساتھ تھا، یہ سبھی تاشقند کے رہنے والے ہیں، سبھوں کے نام یاد نہیں رہے؛ لیکن یہ قافلہ تین گاڑیوں کا تھا، اللہ تعالیٰ ان سب کو بہترین اجر عطا فرمائے، اس طرح سمرقند کا سفر تمام ہوا۔

بخارا کی طرف

یہ رات ہم لوگوں نے سمرقند میں گذاری اور اگلی صبح بخارا کے لئے روانہ ہوئے، کہا جاتا ہے کہ ''بخ'' کے معنی مشرکانہ عبادت گاہ کے تھے، یہاں اس نام سے بودھوں کی بہت بڑی عبادت گاہ تھی، اسی مناسبت سے یہ شہر ''بخارا'' کہلایا، مگر یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ آج اس پورے خطہ کا تعارف اسلامی علوم کی خدمت سے ہے، بخارا کی شہرت تو امام بخاریؒ کی ذات والا صفات سے ہے؛ لیکن یہ شہر مختلف اکابر صوفیاء اور فقہاء کی بھی خوابگاہ ہے، بخارا پہنچنے سے پچاس کیلومیٹر پہلے شیخ عبدالخالق غجدوانیؒ کا مزار مبارک ہے، یہاں ہم لوگ اُترے اور فاتحہ پڑھا، کچھ وقت یہاں گذارا، پھر آگے بڑھے، شہر سے پانچ کیلومیٹر پہلے مشہور صاحب دل شیخ بہاؤالدین نقشبندیؒ کا مزار ہے، یہ ۷۱۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۹۱ھ میں وفات پائی، شیخ بہاؤالدین نقشبندیؒ سلسلہ نقشبندیہ کے بانی ہیں، تصوف کے سلاسل میں سے یہی سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے، ان کی قبر کی زیارت کا اور یہاں دعاء کرنے کا موقع ملا، یہیں قریب میں ان کے استاذ اور شیخ کی قبر ہے، جو امیر کُلالؒ کے نام سے جانے جاتے ہیں، یہ کُلال کا لفظ ازبک زبان میں کلاں یعنی ''بڑے'' کے معنی میں ہے، یہ ان کا لقب تھا، وہاں بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

اب کافی وقت ہو چکا تھا؛ اس لئے بخاریٰ شہر میں داخل ہونے کے بعد عصر سے پہلے ایک ہوٹل میں تمام ساتھیوں کے ساتھ ظہرانہ کیا گیا، بخاریٰ کے قابل دید مقامات قدیم شہر میں ہیں؛ اس لئے ہمارے بعض رفقاء نے مولانا عبدالقیوم صاحب سے خواہش کی تھی کہ ہمیں قدیم شہر کے کسی ہوٹل میں ٹھہرایا جائے؛ چنانچہ ''ہوٹل صفیہ'' کے نام سے ایک ہوٹل میں نظم ہوا، یہ قدیم شہر میں تھا اور اس کا گرد وپیش بھی اس کی قدامت کا گواہ تھا، چھوٹی گلیاں اور گلیوں میں بعض مٹی کی کچی دیواریں؛ لیکن ہوٹل اندر سے تمام سہولتوں سے آراستہ تھا، یہیں ہم لوگوں نے آرام کیا، عصر کے وقت نکلے اور یہاں کی بڑی مسجد ''مسجد کبیر امام بخاریؒ ''میں عصر کی نماز ادا کی، پھر یہیں مغرب بھی ادا کی، کہا جاتا ہے کہ امام بخاریؒ کا درس اسی مسجد میں ہوا کرتا تھا، یہ بہت ہی وسیع، کشادہ، خوبصورت، بلند دیوار اور منبر ومحراب والی مسجد ہے، یہیں اس مسجد کے صحن کے بعد لگا ہوا مدرسہ ''مدرسہ میر عرب'' ہے، سعید بن عبداللہ یمنی کسی زمانہ

میں بخاریٰ کے امیر تھے، ان کو ''میر عرب'' کہا جاتا تھا، انھوں نے اپنے زمانۂ حکومت (۱۵۳۰ھ تا ۱۵۳۶ھ) میں اس کی تعمیر کرائی تھی، روس کے تسلط تک یہ وسط ایشیا کے طلبہ کے لئے مرکز تھا، یہ ۱۶۰ رکمروں پر مشتمل ہے، اب اس کو عالمی ورثہ میں شامل کیا گیا ہے، موجودہ حکومت نے اس مدرسہ کو گورنمنٹ کے زیر انتظام زندہ کیا ہے، اندر لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی؛ لیکن بعض طلبہ نے جن کو اطلاع ہوگئی، بہت ہی اشتیاق کے ساتھ ملاقات کے لئے نکل آئے۔

یہاں ہمیں امام ابوحفص کبیرؒ جو براہ راست امام محمدؒ کے شاگرد ہیں اور جن کا شمار بڑے حنفی فقہاء میں ہے، کے مزار پر بھی حاضری کا اتفاق ہوا، ایک اور جگہ چہار ابوبکر کہلاتی ہے، اس عمارت میں چار قبریں ہیں، جن میں سے ہر ایک کا نام ابوبکر تھا اور یہ سب اصحاب علم تھے، یہاں بھی پہنچنے کی سعادت حاصل ہوئی، فقہ حنفی کی معروف کتاب ''فتاویٰ خانیہ'' کے مصنف قاضی خان (م: ۵۹۲ھ) بھی یہیں آسودۂ خواب ہیں، وہاں بھی جانے کا اتفاق ہوا، اور تھوڑا سا وقت وہاں گذارا گیا، قاضی خان کے مزار کی زیارت سے فارغ ہونے تک کافی دیر ہوچکی تھی، اس روز ہم لوگوں کے لئے عشائیہ کا نظم بخاریٰ کے ایک مخلص جناب شہروز صاحب کے یہاں تھا؛ چنانچہ ہم لوگ وہاں آگئے، وہیں عشاء کی نماز ادا کی، کھانا تناول کیا، تاشقند اور سمرقند کے احباب کا ایک بڑا قافلہ تو پہلے سے ساتھ تھا، اور بخاریٰ کے بھی بہت سے اہل علم اور مخلصین جمع ہوگئے، ان حضرات کا اصرار ہوا کہ میں کچھ خطاب کروں، میں نے اولاد کی تربیت کی اہمیت کے موضوع پر تقریباً ۵۰ رمنٹ خطاب کیا، اورعزیز مکرم مولانا عبدالقیوم صاحب نے اُزبک زبان میں ترجمہ کیا، میں نے اس موضوع کا اس لئے انتخاب کیا کہ یہ خطہ تقریباً پون صدی الحاد کے زیر سایہ رہا ہے، اور نوجوانوں کو دین سے دور کرنے کی منظم کوششیں کی جاتی رہی ہیں؛ اس لئے اب بہت زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ نئی نسل کی تربیت پر توجہ دی جائے، حاضرین نے بڑی توجہ سے سنا اور بعد میں متعدد حضرات نے کہا کہ آپ نے جس موضوع پر ہمیں نصیحت کی، واقعی یہاں کے ماحول میں اس کی بہت زیادہ ضرورت تھی، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کہلوایا، اس کو وہاں کے لوگوں کے لئے نافع بھی بنادیں۔

نَسَف اور ترمذ

بخاریٰ تاریخی اعتبار سے ایسا گلستانِ علم ہے، جس میں قدم قدم پر فکر ونظر کا شجرۂ طوبیٰ نظر آتا ہے، شمس الائمہ عبدالعزیز حلوانیؒ (م: ۱۰۵۶ھ) جیسا حنفی فقیہ، ابو یزید بسطامیؒ (م: ۱۲۶۱ھ) جیسا درویش، ابوعلی سیناؒ (م: ۴۲۸ھ) جیسا سائنس داں اور محمد بن موسیٰ خوارزمیؒ جیسا فلکیات اور ریاضی کا ماہر اسی سرزمین میں پیدا ہوا، یہیں سے ان کا فیض جاری ہوا، مگر وقت نے اجازت نہیں دی کہ ان کی یادگاروں کی زیارت کی جائے؛

چنانچہ ۱۳؍ مارچ کی صبح ہم لوگ بخاریٰ سے ترمذ کی طرف روانہ ہوئے، بخاریٰ سے ترمذ کا فاصلہ چھ سو کیلومیٹر سے بھی زیادہ ہے، اس سلسلہ میں مولانا عبدالقیوم سلمہ کا مشورہ تھا کہ یہ سفر جہاز سے کرلیا جائے؛ لیکن پھر یہ بات سامنے آئی کہ ترمذ اور بخاریٰ کے درمیان نَسَف نامی شہر ہے، جس کو آج کل ''قرشی'' کہتے ہیں، اور نسف میں بڑے اہل علم گذرے ہیں، اگر کار سے جایا جائے اور ایک وقفہ نَسَف میں کرلیا جائے تو وہاں کے تاریخی مقامات کی بھی زیارت ہوجائے گی اور تھوڑا آرام بھی ہوجائے گا؛ چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا، ہم لوگ تقریباً دوپہر میں نسف پہنچے، یہاں امام ابومنصور ماتریدیؒ کے اجلہ تلامذہ میں سے ایک علامہ ابومعین نسفیؒ (م: ۵۰۸ھ) کا مزار ہے، جن کی کتاب ''تفسیر الادلہ فی اصول الدین'' معروف ہے، اس کے علاوہ اصول فقہ اور علم کلام پر ان کی متعدد کتابیں ہیں؛ چنانچہ ہم لوگ اُن کے مزار پر گئے، پھر وہاں سے آگے بڑھے، جمعہ کا دن تھا، اور سرِ راہ ایک دیہات '' تینگا آرام'' کی مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی، یہ راستہ اتنا طویل تھا اور ہم لوگ اس قدر تھک چکے تھے کہ راستہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا، بہر حال چار بجے ترمذ سے متصل علاقہ شیرآباد پہنچنا ہوا، اسی شیرآباد میں امام محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ (م: ۲۷۹ھ) کا مرقد ہے، یہاں حاضری ہوئی، فاتحہ پڑھا اور تھوڑی دیر توقف کیا، یہ بہت خوشی کا لمحہ تھا؛ کیوں کہ امام ترمذیؒ کی سنن کو برصغیر کے مدارس میں خاص اہمیت حاصل ہے، اس اہم کتاب کو پڑھنے کا بھی موقع ملا اور سالہا سال پڑھانے کا بھی، امام ترمذیؒ امام بخاریؒ کے مایہ ناز شاگرد تھے، جناب عبدالرحمن ترمذی کے یہاں ظہرانہ کا نظم تھا، وہیں جاکر تاخیر کے ساتھ ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا کھایا، یہاں وہ حجرہ بھی تھا، جس میں وہاں کی روایت کے مطابق قرآن مجید حفظ کرانے کا انتظام ہوتا تھا، اس کے بعد ہم لوگ ترمذ شہر میں داخل ہوئے اور وسط شہر میں افروز ہوٹل میں قیام کیا؛ چوں کہ بہت تھک گئے تھے؛ اس لئے اب باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

اگلی صبح یعنی ۱۴؍ مارچ کو پہلے ہم لوگ ''مرکز علمی امام ترمذیؒ '' حاضر ہوئے، یہ بھی حکومت کے زیر انتظام قائم ایک تعلیمی مرکز ہے، جس میں حدیث وفقہ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے، عمارت بہت شاندار اور نوتعمیر شدہ ہے، ابھی طلبہ تین چار ہی ہیں؛ البتہ حکومت اس کو آئندہ وسعت دینا چاہتی ہے، یہاں بھی مولانا عبدالقیوم نے میری تالیفات لائبریری میں جمع کرائیں، یہاں ہم لوگ محمد بن علی حکیم ترمذی کے مزار پر بھی گئے، جو بڑے صوفی بھی تھے اور محدث بھی، جن کی کتاب ''نوادر الاصول'' حدیث کا بڑا اہم مجموعہ ہے، یہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے ہیں، ان کا مزار شہر سے تین کیلومیٹر کے فاصلے پر دریائے جیحون کے کنارے واقع ہے، بہت ہی پُر فضاء منظر ہے، گورنمنٹ نے یہاں بڑا پارک بنایا ہے، یہاں خانقاہی حجروں کو دیکھنے کا موقع ملا، زیر زمین کئی حجرے بنے ہوئے تھے، میں نے تو اوپر سے دیکھا؛ لیکن دوسرے ساتھی سیڑھی سے اتر کر نیچے تک گئے، یہ اصل میں ذاکرین کے لئے

بنائے گئے تھے کہ وہ ان حجروں میں چلہ کشی کر سکیں؛ لیکن کمیونسٹ دور میں یہی حجرے خفیہ طور پر بچوں کی تعلیم کے لئے استعمال کئے جاتے تھے اور حفظ قرآن کی اور دین کی بنیادی باتوں کی تعلیم دی جاتی تھی، یہاں سے نکل کر دریائے جیحون صاف نظر آتا ہے، کافی کشادہ دریا ہے، ازبکستان کی سیرابی ''دریائے جیحون اور دریائے سیحون'' ان ہی دو دریاؤں سے ہوتی ہے، اُن کے درمیان کے علاقے کو ''ماوراء النہر'' کہا جاتا تھا، یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترمذ کو پہلی بار حضرت عثمان بن عفانؓ کے صاحبزادے سعیدؒ نے صلح کے ذریعہ فتح کیا تھا؛ مگر بار بار کی شورش کی وجہ سے یہ علاقہ قبضہ میں آتا اور جاتا رہا، یہاں تک کہ ۹۳ھ میں قتیبہ بن مسلمؒ نے فتح کیا۔ دریائے جیحون سے متصل افغانستان ہے، وہاں سے افغانستان کی عمارتیں صاف نظر آتی ہیں، یہاں پر ایک قلعہ بھی ہے، جو فوج کی تحویل میں ہے، یہاں سے نکل کر ہم لوگوں نے گاڑی ہی سے سرسری طور پر شہر کی گشت کی، اور ائیر پورٹ پہنچ گئے، جہاں سے ہمیں تاشقند واپس ہونا تھا، اس بات سے خوشی ہوئی کہ ائیر پورٹ کا عملہ دینی نسبت کی بناء پر خصوصی ادب واحترام کے ساتھ پیش آیا، جو وہاں کے لوگوں کا مزاج ہے۔

سیرِ تاشقند

ترمذ سے تاشقند کا ہوائی سفر ایک گھنٹہ کا ہوتا ہے؛ چنانچہ ڈیڑھ بجے ہم لوگ تاشقند پہنچ گئے، اور سابقہ ہوٹل ''اورینٹل اِن'' پہنچ کر دن کا کھانا تناول کیا، ابھی تک ہم لوگوں نے تاشقند کے قابل دید مقامات میں سے ایک دو ہی کی زیارت کی تھی؛ اس لئے آج کا دن شہر کی سیر کے لئے رکھا گیا تھا؛ چنانچہ عصر کی نماز مسجد مینار میں پڑھی گئی، یہ بڑی خوبصورت مسجد ہے، اور اس کا مینارہ بھی بہت عظیم الشان ہے، جو غالباً ۴۳ رمیٹر اونچا ہے، اسی احاطہ میں امام ابو قفال شاشیؒ (۲۹۱ — ۳۶۵ھ) کے مزار پر جانے کی سعادت حاصل ہوئی، جو بڑے شافعی عالم تھے اور اس خطہ میں ان ہی کے ذریعہ فقہ شافعی کی اشاعت ہوئی؛ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ بہت سے مسائل میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پر فتویٰ دیتے تھے، یہیں پر مدرسہ براق خاں کی عمارت بھی ہے، ازبکستان کی دوسری تاریخی عمارتوں کی طرح یہ بھی بہت خوبصورت اور پُرشکوہ ہے، افسوس کہ روسیوں کے عہد سے اس کا استعمال مارکٹ کے طور پر ہو رہا ہے، اس کو شیبانیوں کے عہد حکومت میں نوردز احمد خان نے تعمیر کیا تھا، جو براق خاں سے مشہور تھا، یہیں وہ عمارت بھی ہے، جس میں بڑے اہتمام کے ساتھ ''مصحف عثمانی'' کو رکھا گیا ہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن مجید کی کتابت کرا کر مختلف جگہوں کو بھیجا تھا، کہا جاتا ہے کہ یہ نسخہ خود ان کے زیر تلاوت تھا؛ اسی لئے بتایا جاتا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے وقت جو خون (دھبہ) گرا تھا، اس کا نشان بھی اس مصحف پر

موجود ہے، سرخ دھبہ تو ہم لوگوں نے بھی دیکھا؛ مگر اس دعویٰ میں کس حد تک صداقت ہے؟ معلوم نہیں، یہ مصحف دراصل امیر تیمور اپنے ساتھ تاشقند لایا تھا، روسیوں نے اس کو سینٹ پیٹرز برگ منتقل کر دیا تھا، ۱۹۸۹ء میں یہ نسخہ ازبکستان کو واپس ملا، لوگ بڑی عقیدت سے اس کی زیارت کرتے ہیں۔

آج رات کے کھانے کا انتظام جناب اکرام صاحب کے یہاں تھا، ان کے بیٹے عزیزی الہام سلمہ ہمارے عزیز مکرم مولوی عبدالقیوم صاحب کے ساتھ ان کی مسجد میں نائب امام ہیں، مغرب کی نماز ہم لوگوں نے ان ہی کی مسجد میں ادا کی، ماشاء اللہ بہت وسیع، کشادہ اور خوبصورت مسجد ہے، کھانے کا بھی انھوں نے بہت اعلیٰ درجہ کا اہتمام کیا تھا، کھانے کے بعد دعاء کی گئی، علمی مقامات اور مقدس شخصیات کی زیارت کا سلسلہ یہاں مکمل ہوا، تمنا تو ''فرغانہ'' جانے کی بھی تھی، جو صاحب ہدایہ کی جائے ولادت ہے، اسی کے ایک شہر ''اوش'' سے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور فتاویٰ سراجیہ کے مصنف علامہ سراج الدین اوشیؒ کا تعلق ہے اور پہلا مغل حکمراں بابر بھی یہیں کا تھا، ازبکستان ہی میں ''خوارزم'' ہے، جس کو آج کل ''خیوہ'' کہا جاتا ہے، فقہ حنفی کی کتابوں میں بہت سی آراء علماء خوارزم کے حوالہ سے نقل کی گئی ہیں، اور مختلف دینی اور سائنسی علوم کے ماہرین یہاں پیدا ہوئے ہیں؛ مگر یہ علاقے کافی دُور تھے اور ہم لوگوں کے پاس وقت نہیں تھا؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اس سفر نے تشنگی اور بڑھا دی۔

ہمارے مقررہ نظام اور ہندوستان واپسی کے بنے ہوئے ٹکٹ کے لحاظ سے ۱۵/ مارچ کی تاریخ قیام کا آخری دن تھا، ۱۶/ مارچ کو ہماری واپسی تھی، ۱۵/ مارچ کو میز بانوں نے ایک تفریحی پروگرام رکھا، وہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو کیلومیٹر پر ایک ایسی پہاڑی ہے، جس کی سطح بہت اونچی ہے اور جو برف سے ڈھکی رہتی ہے؛ چنانچہ ہم لوگ جناب نظام الدین صاحب تاشقندی کی گاڑی سے چلے، ان ہی کے گھر ناشتہ ہوا، اس سفر میں متعدد رفقاء کے علاوہ مولانا حکمت اللہ صاحب (فاضل دارالعلوم کراچی) اور مفتی عبدالمنان صاحب (فاضل دارالعلوم دیوبند) بھی ہمارے ساتھ تھے، ہم لوگ دوپہر کے قریب اپنی منزل مقصود پر پہنچے، اس جگہ کو ''کنوش کان'' کہا جاتا ہے، کنوش کے معنی ازبک زبان میں ''چاندی'' کے ہیں، بتایا گیا کہ اس پہاڑ سے چاندی کافی مقدار میں نکلتی ہے؛ اسی لئے اس کو کنوش کان کہتے ہیں، یہاں نظام الدین صاحب کا فارم ہاؤس بھی ہے، ہم لوگ وہیں ٹھہرائے گئے، کشمیر کا سا منظر ہے، ہرا بھرا علاقہ اور کسی قدر ٹھنڈ بھی، پھر ہم لوگ گاڑی سے برف پوش پہاڑی کی طرف لے جائے گئے، جس مقام تک گاڑی جا سکتی تھی، میں تو وہاں اتر گیا، زیادہ تر رفقاء سفر بھی میرے ساتھ ہو گئے، عزیزان مولانا ارشدین اور بعض احباب سیڑھی کے ذریعہ اوپر اس مقام تک پہنچے، جہاں برف کی تہیں جمی ہوئی ہیں، وہاں تھوڑا سا وقت گذار کر پھر نظام الدین صاحب کے فارم ہاؤس پر واپسی ہوئی، یہیں ہم لوگوں نے کھانا تناول کیا، اگر چہ اجازت حدیث

کی مجلس آج رات میں دوستوں نے رکھی تھی؛ لیکن جو علماء موجود تھے، ان کا خیال ہوا کہ انہیں یہیں حدیث کی اجازت دے دی جائے؛ چنانچہ میں نے ''مسلسل بالاولیۃ والی حدیث'' اور بخاری کی ایک حدیث پڑھ کر ان حضرات کو حدیث کی اجازت دی، اور یہاں سے تاشقند کے لئے روانہ ہو گئے۔

مغرب بعد مسعود خان صاحب جو حضرت مولانا قمر الزماں صاحب دامت برکاتہم (الٰہ آباد) سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں ہیں، اور مدینہ منورہ میں ان سے بیعت ہو چکے ہیں، کے یہاں عشائیہ کا نظم تھا، ان کے یہاں مختلف مساجد کے ائمہ، علماء اور حفاظ کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی، موقع کے لحاظ سے میرا خطاب بھی ہوا، میں نے عرض کیا کہ ''قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ان کو گناہ کی دعوت دی گئی، نبی تو یوں بھی معصوم ہوتا ہے؛ لیکن ان کو اس دعوت سے متأثر ہونے سے بچانے میں جو باتیں مؤثر ہوئیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے رب کی برہان دیکھ لی: ''لو لا أن رأ برهان ربه'' (یوسف: ۲۴) برہان رب سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں کئی باتیں کہی گئی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی شکل ان کے سامنے آ گئی، اور نبی کی اولاد ہونے کی نسبت نے ان کی دستگیری کی، تو معلوم ہوا کہ دینی نسبت انسان کو دین پر قائم رکھنے اور گناہ سے بچانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، یہی نسبت آپ لوگوں کو حاصل ہے، اس سرزمین میں ایسے محدثین، فقہاء، صوفیا، اہل علم اور اہل دل پیدا ہوئے، جن کے نام سے آج دنیا کا چپہ چپہ گونج رہا ہے، آپ کی عزت نہ پٹرول سے ہے اور نہ ترقی یافتہ ٹکنالوجی سے، آپ کا ملک نہ فوجی اعتبار سے سپر پاور ہے اور نہ معاشی اعتبار سے؛ لیکن دین کی نسبت نے آپ کو عزت دی ہے، اس نسبت کا خیال رکھئے، اور اس کو اگلی نسلوں تک پہنچائیے'' اس کے بعد حدیث کی اجازت دی گئی، مولانا حکمت اللہ صاحب نے میرے خطاب کا ازبک ترجمہ کیا اور اندازہ ہوا کہ انھوں نے ماشاء اللہ میری پوری بات حاضرین تک پہنچائی، مولانا مسعود خان خود بھی عالم ہیں، اور تاشقند میں قائم ''معہد عالی اسلامی اکیڈمی'' میں تاریخ کے استاذ ہیں، یہیں ہم لوگوں کو یہ افسوس ناک اطلاع ملی کہ جو فلائٹ ہندوستان آنے والی تھی، وہ کینسل ہو گئی ہے، اس کی وجہ سے طبیعت پر جو بوجھ ہوا ہوگا، وہ ظاہر ہے، بہر حال اب کوشش شروع ہوئی؛ لیکن ۲۱؍ مارچ سے پہلے ہم لوگوں کی واپسی نہیں ہو پائی، اس درمیان ایک تو عزیزی مولانا عبد القیوم صاحب نے مجھ سے میرا رسالہ ''آسان اصول فقہ'' سبقاً سبقاً جس قدر ہو سکا، پڑھا؛ حالاں کہ خود ان کی اردو اچھی ہے، اور وہ باصلاحیت عالم ہیں، مگر ان کی خواہش تھی کہ کچھ اسباق میں پڑھاؤں، اور پھر چوں کہ اتفاق سے وہ جمعہ کا دن تھا تو سورۂ جمعہ کے دوسرے رکوع کا بھی درس دیا، ہمارے ہندوستان کے ساتھی بھی اس درس میں شامل ہو گئے۔

ہلال نشر میں حاضری

اس فرصت میں ہم لوگوں کو ایک اہم ادارہ کے معاینہ کا موقع مل گیا، جہاں اب تک جانا نہیں ہوا تھا، اور وہ ہے ''ہلال نشر'' اس کے بانی حضرت مولانا محمد صادق صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، یہ رابطہ عالم اسلامی کے بھی رکن تھے، انھوں نے ازبکستان میں اسلام کی اشاعت اور اس کی بقاء کے لئے بڑی خدمت انجام دی ہے، کمیونسٹوں کے دور میں کچھ عرصہ لیبیا میں اپنا وقت گذارا، جب یہاں سے کمیونسٹ اقتدار ختم ہوا تو واپس آئے، اور پوری توجہ ازبک زبان میں اسلامی لٹریچر کی تیاری پر مبذول کر دی، ان کی ایک بہت تفصیلی تفسیر ازبک زبان میں ہے، حدیث کی شرح ہے، فقہ پر کتابیں ہیں، اصلاحی کتابیں بھی ہیں، ایک سو بیس کتابیں ان کے قلم سے منظر عام پر آچکی ہیں، اس وقت اس ادارے کے ذمہ دار اُن کے صاحبزادے مولانا اسماعیل صادق ہیں، جن کو عربی زبان پر اچھی قدرت حاصل ہے، اور ادھیڑ عمر کے آدمی ہیں، ماشاء اللہ یہاں سے ماہانہ قرآن مجید کے ۲۰؍ ہزار نسخے شائع ہوتے ہیں، اور وسط ایشیائی ممالک میں پہنچتے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے دینی موضوعات پر کتابیں شائع ہوئی ہیں، ازبکستان اور اس کے مضافات کے ممالک میں قرآن مجید اور اسلامی لٹریچر کے پہنچانے کا یہ سب سے اہم مرکز ہے، یہاں کی خدمات کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، اگلے دن اس مرکز سے نکلنے والے اخبار میں انھوں نے میری تصویر اور میری گفتگو کا خلاصہ بھی نقل کیا، میں نے ان کے والد ماجد مولانا صادق صاحبؒ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے تھے کہ ہمارے یہاں ''ایک آدمی'' ایک اکیڈمی کا کام کرتا ہے، تو آپ کے والد صاحب کا کام بھی اسی زمرے میں شامل ہے، اس جملے کو انھوں نے خاص طور پر کوڈ کرتے ہوئے فیس بک پر نقل کیا، اور سوشل میڈیا میں اس کی کافی اشاعت ہوئی، بہر حال ان کی خدمات واقعی لائق تحسین ہیں، اللہ تعالیٰ ان ملکوں میں اسلام کی اشاعت کا سروسامان فرمائے، حکومت نے ان کی اعلیٰ خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے نام سے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی ہے، جس کے ڈیزائن میں قدامت اور جدت کا خوبصورت امتزاج ہے۔

اسلامی معاہد کا نصاب تعلیم

ہم لوگوں نے تاشقند، سمرقند، بخارا اور ترمذ ہر جگہ دینی تعلیم کے معاہد دیکھے، ان کے نصاب تعلیم میں یکسانیت پائی جاتی ہے؛ کیوں کہ یہ سب سرکاری نظام کے تابع ہیں، ہر جگہ پانچ سالہ نصاب ہے، اور ہر سال میں دو سمسٹر (دورانئے) ہیں، گویا کُل دس سمسٹر میں تعلیم ہوتی ہے، اس میں قرآن کریم، تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ اسلام

کے علاوہ نحو، صرف اور فلسفہ ومنطق کے مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں، نصابِ تعلیم کی بعض چیزیں ایسی ہیں، جن سے ہندوستان کے مدارس بھی استفادہ کر سکتے ہیں، جیسے: تجوید قرآن، تفسیر قرآن اور احکام قرآن، تینوں کو مستقل مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے، حدیث میں متون حدیث، شروح حدیث، احادیثِ احکام، اصطلاحات حدیث، تخریج حدیث اور اسناد کی تحقیق کی الگ الگ مضمون کی حیثیت سے تعلیم دی جاتی ہے، فقہ میں فقہ حنفی کی تعلیم ہوتی ہے، اور احادیث احکام کو بھی اسی نقطۂ نظر سے پڑھایا جاتا ہے۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ نصاب میں کئی کتابیں ہندوستان کے مصنفین کی ہیں؛ چنانچہ اصول فقہ میں ملا جیونؒ کی ''نورالانوار''، اصول حدیث میں مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ کی ''الرفع والتکمیل '' اور مولانا ظفر احمد تھانویؒ کی '' فوائد فی علوم الحدیث''، نیز متون حدیث میں ان ہی کی ''اعلاء السنن'' شامل ہے، اس پانچ سالہ نصاب کی تکمیل پر گریجویشن کی سند دی جاتی ہے اور اس سند کی بنیاد پر طلبہ یونیورسیٹی میں اسلامی وعربی علوم میں ماسٹر کر سکتے ہیں، اس سے پہلے کے مرحلہ کی تعلیم سرکاری نصاب کے مطابق ہوتی ہے اور ہائی اسکول سطح کی تعلیم کے بعد اِن مَعاہد میں داخلہ ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برصغیر کے دینی مدارس میں جو نصاب اور تدریس کا جو اسلوب مروج ہے، وہ بہت ہی مفید اور اہمیت کا حامل ہے، اس کے ذریعہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے سے علوم اسلامی کے تمام شعبوں میں قدآور شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں، اور آج بھی اس کا تسلسل قائم ہے؛ لیکن پوری دنیا اور خود ہمارے ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں ضرورت ہے کہ اہل مدارس اپنے تعلیمی نصاب اور نظام پر نظر ثانی کریں، مدارس کے مقاصد اور اس کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے ایسا نصاب مرتب کریں، جو زمانہ کی ضرورتوں سے ہم آہنگ ہو؛ تاکہ طلبہ مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد جب باہر کی دنیا میں پہنچیں تو اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کریں اور احساس کمتری میں مبتلاء نہ ہوں، اس کی آسان اور بہتر شکل یہی ہے کہ موجودہ درسِ نظامی سے پہلے ثانویہ کا مرحلہ رکھا جائے، جس میں ہائی اسکول یعنی دسویں کلاس تک کے مضامین پڑھائے جائیں، اور مروجہ درس نظامی کے ابتدائی دو تین سالوں کے مضامین کو بھی اسی مرحلہ میں شامل کر لیا جائے، پھر مروجہ درس نظامی کا نصاب پانچ سالوں میں پڑھا دیا جائے، اس طرح بہت کم تبدیلی کے ساتھ اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

اس پورے سفر میں ایک صالح نوجوان جو قدم قدم پر ساتھ رہے اور بڑی خدمت کی، وہ ہیں عزیز مکرم آبی جان سلمہ، وہ اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے ساتھ خود اپنے شوق سے قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں، ۱۸/ مارچ کو دوپہر میں انھوں نے ضیافت کا اہتمام کیا، جس میں مہمانوں کے ذوق کی رعایت کرتے ہوئے ہندوستانی طرز کے کھانے

بنوائے، اسی دن رات میں جناب مظفر صاحب کے یہاں عشائیہ کی دعوت تھی، حاضرین کی خواہش تھی کہ میں کچھ عرض کروں؛ چوں کہ یہاں مجھ سے کثرت سے ایسے سوالات کئے گئے، جن کا تعلق سودی لین دین سے تھا، فقہ کی کتابوں میں بھی اس خطہ کے بعض ایسے مروجہ معاملات کا ذکر آیا ہے، جن میں سود کا شبہ پایا جاتا ہے، اس مناسبت سے میں نے یہاں رزق حلال کی اہمیت، سود کا گناہ اور خود اس دنیا میں سود کے نقصانات پر روشنی ڈالی، بحمد اللہ لوگوں نے قبولیت کے جذبہ سے سنا اور کافی سوالات بھی کئے۔

۲۱؍مارچ کو ہم لوگوں کی ازبکستان ائیر لائنز سے واپسی ہوسکی، ہمارے ہوٹل ''اور ینٹ اِن'' کے مالک کا نام جناب عبد الغفور تھا، وہ بھی چند دنوں کے قیام میں بہت مانوس ہوگئے، بڑی محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہوئے دُعاء کراتے، پانی پر دم کراتے، جو کرایہ مقرر تھا، اس میں بھی انھوں نے بلا مطالبہ اپنی طرف سے کافی تخفیف کردی، اور ایک ترکی ریسٹورنٹ میں ہم لوگوں کی پُرتکلف دعوت بھی کی، جس وقت ہم لوگوں کو نکلنا تھا، اس دن ان کے یہاں شادی کی تقریب ہونے والی تھی، پھر بھی ملاقات کرنے کے لئے آئے، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ پیش آیا کہ واٹس ایپ پر میری آمد کی اطلاع اور مختصر تعارف بعض مقامی احباب نے نشر کردیا تھا، انھوں نے بھی پڑھا، وہ ملاقات کے مشتاق تھے؛ مگر ان کو معلوم نہیں تھا کہ ہم لوگ ان ہی کے ہوٹل میں مقیم ہیں، انھوں نے ملاقات کے لئے کسی سے دریافت کیا، اور بتایا گیا کہ میں ان ہی کے ہوٹل میں مقیم ہوں، تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، گفتگو کے دوران جب اذکار واوراد کے سلسلہ میں ان کے یومیہ معمولات کا حال سنا تو مجھ کو اپنا معمول بہت حقیر نظر آیا، واقعی کیچڑ میں بھی لعل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

۲۱؍مارچ کی صبح کو ہم لوگوں کی ہندوستان واپسی تھی؛ چنانچہ ۲۰؍مارچ کی شب میں سید عظیم صاحب نے کھانے کا اہتمام کیا، جہاں بھی اس طرح کی دعوت ہوتی، شہر کی اہم دین پسند شخصیتوں کو یہ حضرات مدعو کرتے، یہاں بھی منتخب مجمع تھا، حاضرین کی خواہش تھی کہ کچھ دینی باتیں کہی جائیں، کمیونسٹوں کے دور میں یہاں جو گمراہیاں پھیلائی گئیں، ان میں ایک عورتوں کی بے قید آزادی بھی ہے؛ اگرچہ یہاں بے پردگی کا ماحول کم نظر آیا؛ لیکن فکری اعتبار سے مغرب کی آزاد خیالی کا اثر خواتین میں پایا جاتا ہے، اور خواتین کی دینی تعلیم وتربیت سے بے توجہی کا احساس ہوتا ہے، اس پس منظر میں عرض کیا گیا کہ اسلام کی دعوت اور اسلامی علوم کی اشاعت میں خواتین کا بڑا اہم کردار رہا ہے، اس سلسلہ میں صحابیات کی بعض مثالیں بھی پیش کی گئیں اور وہاں کے موجودہ حالات میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی کیا شکل اختیار کی جاسکتی ہے؟ اس پر روشنی ڈالی گئی۔

چند نقوش عبرت وموعظت

اس سفر میں جو چند قابل توجہ باتیں سامنے آئیں، ان کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، پہلی بات یہ ہے کہ اس پورے خطہ پر کمیونزم کے غلبہ کا جو دور گزرا ہے، اس میں نہ صرف مساجد ومدارس اور دینی مراکز کو تہس نہس کرنے یا وہاں سے انجام دی جانے والی دینی خدمات کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی؛ بلکہ لوگوں کے دل ودماغ کو بدلنے کے لئے بھی پورا زور لگا دیا گیا، بے حیائی وفحاشی کو پھیلانے کی بھرپور کوشش کی گئی، نوجوانوں کو دین بیزاری کے انجکشن لگائے گئے، خواتین کو آزادیٔ نسواں کی دعوت دی گئی؛ لیکن جب روس کا اقتدار ختم ہوا تو بہت کم عرصہ میں الحاد ودہریت کو پسپا ہونا پڑا، اور پوری قوم پر اسلام کا رنگ چڑھ گیا؛ چنانچہ آج مسجدوں میں نوجوانوں کی بڑی تعداد نظر آتی ہے، داڑھی کی ممانعت کے باوجود داڑھی رکھنے کا جذبہ ہے، عورتیں عام طور پر ساتر لباس اور حجاب استعمال کرتی ہیں، دوسرے مسلمان ملکوں کے مقابلہ یہاں خواتین کے باپردہ لباس پہننے کا رواج زیادہ ہے؛ البتہ عمومی طور پر عورتیں چہرہ کھلا رکھتی ہیں، ہمارے ملک میں سڑکوں کے کنارے نیم عریاں تصویریں کثرت سے نظر آتی ہیں؛ لیکن یہاں ایسے اشتہارات نظر نہیں آتے، یہ ایک خوش آئند بات ہے اور اس سے اسلام کی روحانی طاقت، فکری سربلندی اور لوگوں کو متأثر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، مسلمانوں میں عمل کی کوتاہی جس درجہ کی بھی ہو؛ لیکن ان کو اپنا ایمان عزیز ہوتا ہے، اللہ کرے یہاں دینی جذبہ کو اور فروغ ہو اور اس خطہ کی عظمت رفتہ واپس آسکے۔

یہاں جو ایک خاص بات دیکھنے میں آئی، وہ ہے دین، شعائرِ دین اور اہل دین کے لئے بے حد ادب اور جذبۂ توقیر، اپنے بزرگوں کی یادگاروں سے تو انہیں محبت ہے ہی؛ لیکن علماء ومشائخ سے بھی ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں، خیر کے کام میں خرچ کرنے کا جذبہ ہے، اب جو مسجدیں تعمیر ہورہی ہیں، وہ عوامی تعاون سے ہورہی ہیں؛ لیکن یہ تعمیر بھی اسی دور کی یاد دلاتی ہے، جو یہاں کا سنہرا دور تھا، مساجد میں ایک امام کے ساتھ کئی کئی نائب امام ہوتے ہیں اور مؤذن اس کے علاوہ ہوتا ہے، ایک مسجد کے بارے میں استفسار پر معلوم ہوا کہ یہاں چار امام ہیں، دو مؤذنین ہیں اور مسجد کے خدام ان کے علاوہ ہیں، میں نے مزاحاً کہا کہ آپ نے ایک ہی مسجد میں ائمہ اربعہ کو جمع کر دیا ہے، خدام مسجد کی تنخواہیں عوام ہی کے اجتماعی تعاون سے ادا ہوتی ہیں، دینی خدمت گزاروں کی یافت دوسرے شعبوں کے ملازمین کے برابر تو نہیں ہوتی ہے؛ لیکن اتنا فرق بھی نہیں ہوتا ہے جو ہندوستان میں دین کے خادموں اور دوسرے شعبوں کے خدمت گاروں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

لوگوں میں خوش سلیقگی بھی دیکھنے کو ملی، صفائی ستھرائی کا بہت زیادہ اہتمام ہے، حکومت کا عملہ اس کام کو انجام دیتا ہے؛ لیکن عوام میں بھی اس کا پورا لحاظ ہے، مسجد اور اس کے طہارت خانے بھی صاف ستھرے نظر آتے ہیں،

مسجدوں میں یہ بات بھی بہت اچھی محسوس ہوئی کہ لوگ سیڑھیوں کے باہر قطار میں لگا کر اپنے جوتے رکھتے ہیں، بے سلیقگی کے ساتھ جوتے نہیں رکھے جاتے، لوگوں کے تعمیری ذوق میں بھی بڑی نفاست ہے، اور گھر کا اندرونی حصہ بہت ہی آراستہ وپیراستہ ہوتا ہے، فرنیچر اور کھانے کے برتن وغیرہ سے بھی نفاست اور خوش ذوقی کا اظہار ہوتا ہے، ضیافت کا جذبہ غیر معمولی ہے، عام طور پر ان کے کھانوں میں دال اور سبزی کا گزر نہیں، خوب گوشت کھایا جاتا ہے، ترکی کی طرح یہاں بھی کباب کا خاص ذوق ہے، بڑے جانور کا بھی، بکرے کا بھی اور چکن بھی؛ بلکہ یہاں گھوڑے کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے، ہم لوگوں کے سامنے بھی رکھا گیا، میں نے عرض کیا: آپ حضرات کھا سکتے ہیں؛ کیوں کہ جمہور اور صاحبین کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس لئے مکروہ ہے کہ اس سے آلۂ جہاد کی قلت پیدا ہوسکتی ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ اب اس دور میں گھوڑے کا استعمال جہاد کے لئے نہیں ہوتا؛ اس لئے کراہت کی وجہ باقی نہیں رہی؛ مگر آدمی جو گوشت پہلے سے نہ کھاتا رہا ہو، اس کو کھانے میں طبعی کراہت ہوتی ہے؛ اس لئے میں اس سے بچ رہا ہوں، بہرحال ازبکی حضرات جب کھانے پر مدعو کرتے ہیں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اور عمدہ سے عمدہ کھلایا جائے، دین سے تعلق اور اللہ پر یقین کا ایک مظہر یہ ہے کہ وہ کثرت سے دعاء کراتے ہیں، بار بار دعاء کی درخواست کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اسی وقت دعاء ہوجائے، خاص کر کسی کے گھر پہنچنے پر یا کھانے کے بعد خصوصی اہتمام سے دعاء کرائی جاتی ہے، الحاد ودہریت کی یلغار کے باوجود ان حضرات کو دین پر جو ثابت قدمی حاصل رہی اور کمیونسٹوں کے جاتے ہی یہ اتنی جلد الحاد کے جال سے باہر نکل آئے، خیال ہوتا ہے کہ یہ ان کے دلوں میں دین کی عظمت اور اہل دین کے ادب کا نتیجہ ہے!

ایک سبق جو وہاں کی مساجد کے نظام سے لینے کا ہے، وہ یہ ہے کہ —— جیسا کہ ذکر کیا گیا —— وہاں ایک مسجد میں کئی کئی ائمہ ہوتے ہیں، جو ہیڈ امام ہوتا ہے وہ جمعہ کا خطبہ دیتا ہے، مؤذن بھی غالباً ایک سے زیادہ ہوتے ہیں اور مسجد کے خادمین ان کے علاوہ، طہارت خانوں کی صفائی ستھرائی کا بھی بہت معقول نظم ہوتا ہے، ہندوستان کی صورت حال یہ ہے کہ اکا دکا مسجدوں کو چھوڑ کر مسجد میں ایک ہی امام ہوتا ہے اور ایک ہی مؤذن، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مسجد کی صفائی ستھرائی کی ذمہ داری بھی بعض جگہ مؤذن صاحب پر ہوتی ہے، یہ اس عہدہ کا اعزاز ہے، جس پر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے صحابی فائز تھے، اور جس کام کی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفۂ راشد تمنا کیا کرتے تھے؟؟ طہارت خانوں کی صفائی کا انتظام بھی اتنا ناقص ہوتا ہے کہ اکثر مسجدوں کے بیت الخلاء میں جانے کی ہمت نہیں ہوتی، غور کیجئے، کیا یہی ہے مسجد کا احترام؟ جن مسجدوں کے پاس معاشی وسائل نہیں ہیں، ان کی صورت حال تو یہ ہے ہی، اور یہ ایک حد تک مجبوری بھی ہے؛ لیکن جن مساجد کے پاس معاشی وسائل موجود ہیں، ان

کی انتظامیہ بھی ان کاموں پر خرچ کرنا نہیں چاہتی، یہ بہت ہی افسوس ناک بات ہے، ضرورت ہے کہ ہر مسجد میں امام اور مؤذن کو لے کر کم سے کم تین افراد رکھنے کی کوشش کی جائے اور تینوں میں اذان دینے اور بقدرِ ضرورت نماز پڑھانے کی صلاحیت ہو؛ تاکہ یہ حضرات بھی اپنی گھریلو ضروریات کے لئے نکل سکیں، ان کے لئے ہفتہ وار اور سالانہ چھٹیوں کی سہولت ہو، اگر اپنے فرائض کو ادا کرتے ہوئے موقع ہو تو کوئی چھوٹی موٹی تجارت کر لیں، اسی طرح وضوء خانہ اور بیت الخلاء کی صفائی کے لئے نمازیوں کی تعداد کے اعتبار سے مناسب تعداد میں عملہ رکھا جائے، جھاڑو دینے اور صفائی کرنے کے لئے مسجد کی وسعت کے اعتبار سے علیحدہ عملہ ہو، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ان کاموں کے لئے جز وقتی ملازم رکھا جائے، اس پر توجہ کی بہت زیادہ ضرورت ہے، مسجد کی تعمیر وتزئین پر اور آج کل قالینوں اور جائے نمازوں پر کافی پیسے خرچ کئے جاتے ہیں؛ لیکن مسجد کے اصل کاموں میں بخل سے کام لیا جاتا ہے۔

● ● ●